دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

یورپی اور عرب انقلابات کا تناظر

مجوزہ دستاویز نمبر 3

32 ویں کانگریس 2013ء

www.struggle.com.pk

فہرست

1۔ یورپ

2۔یورپ: دنیا کی کلید

3۔ مانیٹرازم نہ کینیشن ازم

4۔طبقاتی جدوجہد پراس کے اثرات

5۔اصلاح پسندوں کا کردار

6۔بوناپارٹ ازم کے عناصر

7۔یونان

8-سپین

9۔اٹلی

10۔فرانس

11۔برطانیہ

12۔آسٹریا

13۔مشرقی یورپ

14۔نشیب وفراز

15۔مشرقِ وسطیٰ کے انقلابات کا تناظر

16۔ہم نے ماضی میں کیا کہا تھا

17۔ تیونس کی انقلابی چنگاری

18۔انقلاب کی نئی لہر کی اٹھان

19۔مصر

20۔اسلامی بنیاد پرستی؛ایک رجعتی مظہر

21۔لیبیا

22۔مالی کا تنازعہ

23۔شام

24۔کُرد مسئلے کی پیچیدگی

25۔شام میں خانہ جنگی

26۔کویت اور بحرین

27۔ایران

28۔اسرائیل اور فلسطین

29۔حرفِ آخر

ضمیمہ۔وینزویلا:سست روی سے آگے بڑھتا انقلاب

یورپ

2013ء کی ابتدا ہی دھماکہ خیز ہے۔لینن نے اگست 1908ء میں ایک مضمون لکھا تھا، جس کا عنوان تھا ''دنیا کو آگ لگا دینے والا مواد۔'' آج کی بھی دنیا ایسے آتش گیر مواد سے بھری ہوئی ہے۔سامراجی ایک بدمست ہاتھی کی طرح اپنا کردار ادا کرتے جا رہے ہیں۔فرانس افریقی ملک مالی میں مہم جوئی کر رہا ہے۔امریکہ بھی عراق میں بے یقینی اور بدحالی پیدا کرنے کے بعد ''مشن کی کامیابی'' کا اعلان کر چکا ہے۔لیکن یہ اعلان کوئی طاقت کے نشے میں بدمست ہی کر سکتا ہے اور جیسا کہ ہم نے بہت پہلے لکھا تھا کہ آخر کار امریکہ کو یہاں سے دم دبا کر بھاگنا پڑے گا۔عراق میں سامراج کو کیا حاصل ہوا؟ ایک بھیانک بدحالی اور ہولناک بے اطمینانی کے سوا کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آیا۔تمام خطے میں سیاسی عدم استحکام امریکی مہم جوئی کا واحد حاصل وصول ہے۔شام کی صورتحال اس کا واضح اظہار ہے، جو ترکی پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔اب شام کے کُرد ترکی کی سرحد پر اپنا کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ایسی ہی صورتحال عراق میں بھی ہے، جہاں انہیں خودمختاری حاصل ہے، یہی کیفیت ترکی میں کُردوں کے مسئلے کو دوبارہ ابھار رہی ہے۔

لیبیا میں سامراجیوں نے قذافی سے جان چھڑانے کے بعد یہ سوچ لیا تھا کہ وہ بہت زیرک اور ہوشیار ہو گئے ہیں لیکن درحقیقت قذافی ہی ان کے لیے استحکام کا باعث بھی تھا اور تمام علاقے میں ان کے پولیس مین کا کردار بھی ادا کر رہا تھا۔اس کے انہدام کے بعد پیدا ہونے والا عدم توازن اب لیبیا کے پڑوسی ملک مالی میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔یہ امکان بھی موجود ہے کہ نائیجیریا بھی اس بحران میں دھنستا جا رہا ہے کیونکہ امریکا دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک حقیقی عالمی بحران موجود ہے۔سچ تو یہ ہے کہ مالی میں فرانس کی دخل

اندازی سست اور محتاط تھی۔ جب صورتحال کا جائزہ لیا گیا تو وہ ہچکچا رہا تھا لیکن بہر حال انہیں دراندازی پر مجبور ہونا پڑا ورنہ اسلامی بنیاد پرست مالی پر قبضہ کر چکے ہوتے جس سے فرانس کی نائیجر کی طرف جانے والی سپلائی لائن جہاں سے زیادہ تر یورینیم گزرتی ہے اور جس سے فرانس کے پاور پلانٹس کو ایندھن فراہم ہوتا ہے ان کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو جاتا۔ حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ فرانس کو یہ دراندازی ایک سوشلسٹ صدر کی موجودگی میں کرنی پڑی ہے۔ فرانس کو ابتدا میں ہی امریکی اور یورپی اتحادیوں کی طرف دیکھنا پڑا۔ لندن نے محدود پیمانے پر ٹرانسپورٹ جہازوں اور فوجی ماہرین کی شکل میں امداد فراہم کی لیکن جنگی دستوں کی شکل میں کوئی امداد نہیں دی گئی، دوسرے سامراجی ممالک فرانس کو محض دلاسہ دے رہے ہیں کہ آپ شروع کرو ہم آ رہے ہیں۔

لینن اور ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ دہشت گردی جب ایک وبا بن جائے تو یہ ایک پورے عہد کے بحران کی علامت بن جاتی ہے۔ آج ہمیں جس صورتحال کا سامنا ہے وہ معمول کا عارضی بحران نہیں جس میں معیشت کچھ دیر مندی کا شکار ہونے کے بعد پھر سے ٹھیک ہونا شروع ہو جاتی ہے یہ سرمایہ داری نظام کا نامیاتی بحران ہے، اس کی ایک علامت عوامی سطح پر بیروزگاری ہے جو تمام ممالک کو کسی نا کسی حد تک متاثر کرتی ہے، مارکس نے بحران کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا بیروزگاروں کی بڑی تعداد ایک فاضل جتھہ ہوتی ہے، پچھلے دو سو سالوں کے دوران یہ سرمایہ دارانہ نظام کی عمومی خصوصیت رہی ہے۔ پیچھے کی طرف دھکیلنے والا عمومی بحران سرمایہ داری کیلئے ہمیشہ بہت مفید رہا لیکن اس کیفیت میں ہی جب معیشت کے جہاز میں دوبارہ اڑان کی سکت اور صلاحیت بھی ہو۔ اب جو کیفیت ہے اس میں دوبارہ اڑان کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ ایک عالمی رجحان کے طور پر ہم جو محسوس کر رہے ہیں وہ محض پیچھے آنے والے بیروزگاروں کی فوج ظفر موج نہیں ہے۔ ایک ایسا مظہر ہمارے سامنے ہے جو مستقل بیروزگاری کو جنم دیتا چلا جا رہا ہے۔ یہ اشارہ کر رہا ہے کہ اب نظام میں کسی قسم کی ترقی کرنے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ یہ نظام اب اتنی کثیر تعداد کو پیداواری عمل میں شامل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ لاکھوں لوگوں کو مستقل طور پر بیروزگاری کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اب نظام ماضی کی طرح پیداواری قوتوں کا استعمال بھی نہیں کر سکتا۔

نوجوانوں میں بیروزگاری بہت زیادہ بھیانک ہے۔مصر تیونس اور دیگر عرب ممالک میں انقلابی ابھار کا باعث بھی یہی ایک عنصر ہی ہے۔سرمایہ داری اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی۔ ہر بحران کے ساتھ،ایک تو روزگار بڑھ نہیں رہا دوسرے بحالی کی حالت میں یہ مزید گر رہا ہے۔کچھ محنت کش دوبارہ ملازمت تلاش کر لیتے ہیں، عام طور پر کم اجرت پر یا جز وقتی ملازمت کی صورت میں۔یوں ہر جگہ بیروزگاری کی شرح زیادہ بلند چلی آ رہی ہے۔اس سے سماجی، معاشی، سیاسی اور دوسرے ملکوں کے ساتھ خارجی حکمت عملی جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔یہی نہیں اس سے انقلاب پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

سرمایہ داری یونان کے دیومالائی دیوتا ''پروکسٹس'' جیسی ہو چکی ہے جو کہ اپنے مہمانوں کو بستر میں سلانے کیلئے انہیں لٹا کر بستر کے سائز کے مطابق ان کی ٹانگیں اور جسم کے دیگر حصے کاٹ دیا کرتا تھا۔سرمایہ داری اُس کی طرح چیزوں کو اپنی حدود میں لانے کیلئے ایسا ہی کرتی چلی جا رہی ہے۔کٹوتیاں ہی کٹوتیاں کی جا رہی ہیں۔سرمائے کے سنجیدہ ماہرین اور حکمت ساز بھی محسوس کر رہے ہیں کہ صورتحال بہت بگڑ چکی ہے۔ٹیڈ گرانٹ نے کہا تھا کہ کبھی کبھار سرمائے کے ماہرین بھی وہی نتائج اخذ کرتے ہیں جو کہ مارکس وادی سمجھ رہے ہوتے ہیں۔اب یہ ان پر عیاں ہو رہا ہے کہ انہیں ایک سنگین بحرانی عہد کا سامنا ہے۔

اکتوبر 2012ء کے واشنگٹن پوسٹ میں ایک مضمون میں رابرٹ جے سیموئلسن نے لکھا ہے کہ:

''ہم یورپ میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں اور ریاستہائے امریکہ میں بھی جس کے خطرات محسوس کئے جا رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ جدید سماجی نظام اپنی عمر پوری کر چکا ہے۔اٹھارویں صدی کی ابتدا میں صنعتی معاشروں کا انحصار معاشی ترقی اور سیاسی استحکام پر تھا۔معاشی ترقی نے لوگوں کی زندگیوں میں بہتری پیدا کی اور ان کی ریاست کے ساتھ وابستگی پیدا ہوئی۔جنگوں، معاشی زوالوں ،انقلابات اور طبقاتی کشمکش نے اس عمل کو جاری کئے رکھا۔وقت کے ساتھ ساتھ خوشحالی کی بدولت امریکہ یورپ اور ایشیائی علاقوں میں مستحکم جمہوریتیں قائم ہوئیں۔یہ امتیازی مرحلہ اب اس جاری

معاشی بحران کے ہاتھوں پیچھے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا ہے۔ معیشت کا سست رو پھیلاؤ سیاسی عدم استحکام کو بڑھا رہا ہے۔ صورتحال متضاد ہوتی جا رہی ہے۔ تاریخ اور ماضی سے ربط، بہت بری طرح سے ٹوٹ رہا ہے۔

امریکہ کی کیفیت بھی درجے کے اعتبار سے اگرچہ مختلف ہے لیکن نوعیت کے اعتبار سے مختلف نہیں ہے۔ بہت ہی محدود پیمانے پر معاشی نمو سیاسی نظام کی توقعات پورا کرنے کی صلاحیتوں کو متاثر کر رہی ہے۔ لوگ احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ ایسی کیفیت میں انتہا پسند تنظیمیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ اس تقدیر سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ یورپ میں نظام پر لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کو کم کیا جائے اور حقیقی معاشی نمو کیلئے کوششیں کی جائیں، یہی ہمارا سبق ہے جو ہم سیکھ رہے اور اگر ہم اس سے غفلت برتتے ہیں تو تاریخ خود کو دہرائے گی۔''

یہ ایک بہت دلچسپ اور مبنی برحقیقت تجزیہ ہے لیکن اس میں کوئی حل موجود نہیں۔ اس کی وجہ سادہ ہے اور وہ یہ کہ سرمایہ داری میں اس کا کوئی حل موجود ہی نہیں ہے۔

یورپ اس سارے طوفان کا مرکز و محور بن چکا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو سب کی آنکھیں جس ملک پر مرکوز ہونی تھیں وہ امریکہ ہے۔ کیونکہ اس نئے سال کے شروع ہوتے ہی اس کے دیوالیہ پن کے قریب پہنچ جانے کی خبریں آنا شروع ہو چکی ہیں۔ امریکہ اس وقت ناقابل ادائیگی قرضوں کی بدولت مالیاتی ڈھلوان کے دہانے پر ہے۔ اگرچہ اس ساری صورتحال کی وجہ اس کے قوانین ہیں لیکن ہمیں معاملے کی سنجیدگی سے ضرور باخبر رہنا چاہئے۔ امریکی حکمران ڈھٹائی سے لاکھوں لوگوں کی زندگی کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ ریپبلکن اور ڈیموکریٹس دونوں ایک دوسرے کو اس کھلواڑ میں دھکیلتے رہے اور اب کوشش کر رہے ہیں کہ ان میں سے کون تباہی کے اس کنارے سے واپس کھینچ لاتا ہے۔ اس سارے کھیل میں تھیٹر کا عنصر غالب رہا لیکن نظام کے بارے کوئی سنجیدگی موجود نہیں تھی۔ اس لئے یہ ایک نہایت خوفناک اور خطرناک کھیل بن چکا ہے۔

صورتحال کتنی سنجیدہ اور تشویشناک ہو چکی ہے، اس کا اندازہ امریکہ کے ایڈمرل مائیک مولن جوائنٹ چیف آف سٹاف کے ستمبر 2011ء کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک عمومی اصول

ہے کہ جرنیل اس قسم کے بیانات نہیں دیا کرتے۔اس نے کہا کہ ''میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ امریکہ کی قومی سلامتی کو جو واحد حقیقی خطرہ لاحق ہے، وہ قرض ہے۔'' امریکی فوج کا اعلیٰ ترین عہدیدار کسی القاعدہ، کسی چین کو نہیں بلکہ ملک کے قرضے کو خطرہ قرار دے چکا ہے۔اس صورتحال سے جو سمجھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرضہ جس سطح کو پہنچ چکا ہے، وہ ملک کو ایسے سماجی بحران کی طرف لے جا سکتا ہے جو کہ امریکہ کے استحکام کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مسئلے کے حل کیلئے انہوں نے کیا تو کیا کیا۔انہوں نے قطعی کچھ نہیں کیا۔ قرضوں کی شرح اب 3 ٹریلین ڈالر تک پہنچ چکی ہے جو کہ 2010ء سے کہیں زیادہ ہے۔یہ بہت بڑی رقم ہے۔انتہائی خطرناک حد تک بڑی رقم۔امریکہ کے مجموعی قرضوں کا حجم تو 16 ٹریلین ڈالرز کو چھو رہا ہے۔یہ ایک بلیک ہول ثابت ہوا ہے۔عراق اور افغانستان کی جنگیں، بینکوں کو دیے گئے بیل آؤٹس اور ایسے ہی دوسرے پیکج۔یہ سب مل کر اس مالیاتی بلیک ہول کی تخلیق میں اپنا کردار ادا کرتے آئے ہیں۔یہ بھی اب زیادہ دیر نہیں چلے گا۔اس سے انکار کشش ثقل کے قوانین سے انکار کے مترادف ہوگا۔

بحالی کی بڑی بڑی باتیں ہوتی رہی ہیں لیکن بحالی کہاں ہے، کچھ پتہ نہیں۔2012ء کے اختتام کے اعداد و شمار امریکی معیشت کی بہت زیادہ سست روی کی عکاسی کرتے ہیں۔اس میں قابل فہم نکتہ صرف ایک ہے کہ انہوں نے جلد یا بدیر کٹوتیوں کے منصوبے پر عملدرآمد نہ کیا تو ''منڈی'' کو اس صورتحال میں مداخلت کرنی پڑ جائے گی۔جس سے ایسی تباہی سامنے آئے گی جو پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔مقتدر طبقہ، پنشنوں اور اجرتوں میں کٹوتیوں کا مطالبہ کر رہا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ریپبلکن اور ڈیموکریٹس دونوں میں محض سطحی فرق ہے۔بنیادی طور پر دونوں جس بات پر متفق ہیں وہ کٹوتیاں کرنا ہے۔یہ بحران جو کہ امیروں کا پیدا کردہ ہے، اس کی قیمت چکانے کیلئے غریبوں، مریضوں، بوڑھوں اور محنت کشوں کو بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ امریکہ میں طبقاتی کشمکش سے نمٹنے کا یہی آخری حربہ ان کے پاس موجود ہے۔

یورپ: دنیا کی کلید

اس وقت یورپ معاشی اور سیاسی دونوں اعتبار سے عالمی صورتحال کی کلید ہے۔ ماضی قریب میں لاطینی امریکہ کو یہ مقام حاصل تھا، اگرچہ اب بھی وہاں کی صورتحال میں بے یقینی اور تشویش موجود ہے لیکن یورپ کی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔ یورپ میں پرولتاریہ کے عمومی شعور کی وجہ سے اس کی صورتحال کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ آخری تجزیے میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کا پرولتاریہ ہی عالمی انقلاب کا ہراول ہوتا ہے۔

یورپ میں بورژوازی کی صورتحال خطرناک ذہنی تناؤ کا شکار ہے اور اس کا موڈ بھی متشدد ہے۔ سٹاک ایکسچینج پر طاری مندی کا خوف ان کے تناؤ کو کبھی اوپر کبھی نیچے لے جا رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کے انگریزی لغت کے ایک مصنف ڈاکٹر سیموئیل جانسن نے ایک بار کہا تھا کہ ''ایک اچھا خمار ذہن کو بڑی حد تک مرتکز کیے رکھتا ہے۔'' نظام کا بحران جتنا واضح ہو رہا ہے اتنا بورژوا بھی سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یورپ کے مرکزی بینک کا سربراہ ماریو دراغی اور اس جیسے کئی دوسرے یہ کہتے سنائی دے رہے ہیں کہ ''ہم خون کے آخری قطرے تک یورو کو بچانے کی کوشش کریں گے۔'' لیکن الجھن یہ ہے کہ وہ یہ نہیں بتا رہے کہ کس کے خون کے آخری قطرے تک؟

یہ بات واضح ہے کہ اگرچہ چھ ماہ قبل بھی یورپ کی صورتحال انہدام کے دہانے پر کھڑی ہوئی تھی، تاہم ابھی تک یہ منہدم نہیں ہوا۔ یورپ کے اندر اور باہر بنیادی مسائل تا حال حل نہیں ہوئے ہیں بلکہ صورتحال یورپ کے باہر بھی خراب ہو چکی ہے۔ جنوری میں ورلڈ اکنامک فورم جو کہ سوئٹزرلینڈ کے شہر ڈیووس میں ہوا، میں ہمیں معلوم ہوا کہ کس طرح سے بورژوازی کے معاشی ماہرین انہی نتائج پر پہنچے ہوئے ہیں جو کہ ہم مارکسسٹوں نے اخذ کئے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان نتائج کو وہ اپنے طبقاتی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ جریدے گارڈین کے ایک کیپٹلسٹ معیشت دان نے اس پر درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

''ڈیووس گزشتہ پانچ سالوں سے ایک متشدد مزاج کے درمیان جھولتا آ رہا ہے۔ پہلے تردید کا

عمل شروع ہوا۔ پھر خوف کی فضا چھا گئی۔ پھر ایک امید پیدا ہوئی کہ بدترین حالات ختم ہو رہے ہیں۔ پھر یہ ہراساں ہو گئے کہ بدتری تو ختم ہوئی ہی نہیں۔'' وہ مزید لکھتا ہے کہ ''معاشی منیجرز اس مختصر مدت کے عالمی معاشی تناظر اور کیفیت سے باخبر رہے، انہوں نے عالمی معیشت کی مستقل اور مضبوط بحالی کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی اور ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ کمپنیاں نیچے کو دیکھ رہی ہیں اور اپنی توجہ لاگت کو کم کرنے اور خود کو مزید متحرک کرنے پر مرتکز کیے ہوئے ہیں۔ بہت سے کاروبار اپنے اپنے ملازمین کو نکال دینے کے بعد دولتمندی میں اضافہ کر چکے ہیں۔ وہ سرمایہ کاری کو روکے ہوئے ہیں اور اجرتوں پر دباؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ پی ڈبلیو سی رپورٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ انہیں اپنے مرتکز ہو چکے سرمائے کی سرمایہ کاری کرنے کی کوئی جلدی نہیں۔ کاروبار اسی وقت ہی سرمایہ کاری کریں گے کہ جب وہ یہ محسوس کریں گے کہ ان کی اشیا اور خدمات کیلئے طلب میں تڑپ موجود ہے۔ لیکن ڈیووس میں جمع ہونے والے چیف ایگزیکٹو صاحبان کا معاملہ یہ ہے کہ ماضی میں جن پالیسیوں کو نافذ کیے رکھنے کے وہ چیمپئین بنے آ رہے تھے، جن میں مالیاتی کٹوتیاں، کمزور ٹریڈ یونینیں، لاگت میں بے تحاشا کمی، ان سب نے مل کر صارفیت کے اخراجات کا گلا ہی گھونٹ دیا ہے۔ اس سے پہلے بڑھتے ہوئے ہاؤسنگ قرضوں کے ذریعے صارفیت کو سہارا اور تقویت مل رہی تھی۔ لیکن اب بینک ہیں تو قرضہ دینے اور صارفین ہیں تو قرضہ لینے کو ہی تیار نہیں۔''

بورژوازی اس وقت کھربوں ڈالر دبائے بیٹھی ہوئی ہے۔ گزشتہ پانچ سالوں میں اس نے کچھ بھی انویسٹ نہیں کیا ہے جبکہ اجرتوں کو کم سے کم کرنے پر سارا زور ڈالا جا رہا ہے۔ یہ بحران ہر ملک کو اپنی گرفت میں لے گا۔ یہاں تک کہ چین اور جرمنی بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ جرمنی میں مرکل کی مسلسل لیکن گرتی ہوئی حمایت کی وضاحت یوں بنتی ہے کہ ابھی تک جرمنی میں حالات اتنے برے نہیں ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں یہ امید بندھی ہوئی ہے کہ یہ کیفیت مسلسل چلتی ہی رہے گی۔ تاہم جرمنی میں اجرتوں اور دیگر مسائل پر بڑی ہڑتالوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ 2008ء کے بعد کی منڈی کی سکڑتی ہوئی صورتحال اور نامناسب بحالی نے کسی حد تک محنت کشوں کو یہ شکتی دی ہے کہ جو کچھ ان سے چھینا جا رہا ہے اس کیلئے لڑیں۔ آج جو حال جنوبی

یورپ کا ہے کل وہی جرمنی کا بھی مستقبل بنے گا۔ آسٹریلیا، جہاں ابھی بیروزگاری کی شرح صرف 4.5 فیصد ہے، کو بھی اسی قسم کی صورتحال کا سامنا رہے گا۔

یوروزون کی معیشت 2007ء میں عروج پر تھی۔ اگلے سال اس میں شدید زوال آیا اور اب تک یہ معیشت اپنی پرانی حالت میں نہیں آسکی اور اب بھی سبھی اشارے یہ واضح کررہے ہیں کہ یہ اپنی موجودہ حالت سے مزید تنزلی کی طرف جائے گی۔

ماضی میں ہم نے سٹہ بازی اور قرضہ بازی کے پاگل پن کا مشاہدہ کیا ہے۔ قرضہ (کریڈٹ) صرف ایسا ذریعہ ہے کہ جس سے سرمایہ داری کی حدود و قیود کو عارضی اور مصنوعی طور پر پھیلایا جاتا ہے۔ سرمایہ داری، کریڈٹ کی توسیع سے مصنوعی طور پر طلب کو بڑھاتے ہوئے زائد پیداواریت کے بحران سے خود کو بچاتی ہے لیکن پھر یہ صورتحال بعد میں اس سے کہیں بڑے بحران کو جنم دیتی ہے۔ مارکس نے اس صورتحال کو بہت عرصہ پہلے بیان کردیا تھا۔

اس صورتحال کا اشارہ امریکہ کے کریڈٹ کے وسیع پیمانے پر پھیلاؤ میں ملتا ہے۔ 1964ء میں امریکہ میں لوگوں کو دیا جانے والا کل قرضہ ایک کھرب ڈالر تھا جو کہ 2007ء تک 50 کھرب ڈالرز تک جا پہنچا۔ اب زائد پیداوار کا بحران پہلے سے کہیں زیادہ ہوگیا ہے۔ اس کی مختصر وجہ یہ ہے کہ کریڈٹ کا پھیلاؤ، پہلے کبھی نہ سنی جانے والی حد کو پہنچ چکا ہے۔

مانیٹرازم نہ کینیشن ازم

اب مانیٹرسٹ معیشت دان اخراجات کو کم کرکے قرضوں کو کم کرنا چاہ رہے ہیں۔ لیکن اس سے جو نتیجہ نکل رہا ہے وہ یہ کہ طلب میں کمی واقع ہورہی ہے۔ جو بحران کو مزید گہرا اور شدید کرتی جارہی ہے۔ مانیٹرسٹ ماہرین کی بہ نسبت کینیشن ازم کے ماہرین عوامی اخراجات کو بڑھا کر معیشت کو متحرک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کیلئے پھر رقم کی قلت کا مسئلہ درپیش ہے۔ جب تک آپ رقم ادھار نہ لیں، آپ کچھ کرہی نہیں سکتے۔ دوسرا راستہ کرنسی چھاپنے کا ہے۔ جس سے قرض کی شرح مزید بڑھ جاتی ہے جس کا مطلب مزید مسائل کا جنم لینا ہے۔ حقیقت احوال یہ ہے کہ نہ تو

مانیٹرازم نہ ہی کینیشین ازم اس بحران کو ٹال سکتا ہے۔

پرتگال، سپین اور یونان ابھی تک معاشی بحران میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جب سے یہ بحران شروع ہوا ہے، ہر سال بحالی کی پیشین گوئی کی جاتی رہی ہے۔ اب وہ بڑی آسانی سے 2013ء کو بھلاتے ہوئے قرار دے رہے ہیں کہ ان ملکوں میں بحالی کا عمل 2014ء میں شروع ہو جائے گا۔ یورپ میں منڈی کی خرابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کاروں کی فروخت پچھلے سترہ سالوں میں کم ترین سطح پر آ چکی ہے سوائے ان لگژری کاروں کے جو عوامی جمہوریہ چین کو برآمد کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ صنعت کے ہر دوسرے شعبے کی حالت زبوں ہے۔ جرمنی جو کہ اپنے دیگر یورپی ملکوں کی بہ نسبت زیادہ بہتری سے ترقی کی طرف گامزن تھا، اب وہ بھی بحران سے نہیں بچ پا رہا۔ جرمنی ماضی میں بھی اور آج بھی یورپ کا انجن ہے۔ اس حوالے سے جرمنی کی معاشی سست روی نہ صرف یورپ بلکہ باقی دنیا کیلئے بھی زبوں حالی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

چین کی پیداوار بھی سست روی کا شکار ہو چکی ہے۔ جاپان کی شرح نمو ایک جگہ رکی ہوئی آ رہی ہے اور یہ بھی بحران کی حالت میں ہے۔ اگر امریکہ اور یورپ خرچ نہیں کرتے تو چین کیلئے اپنی شرح نمو کو پہلی سی حالت میں جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس کیفیت کے لاطینی امریکہ، خاص طور پر برازیل پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ آسٹریلیا جیسے ممالک، جو کہ چین کی ترقی پر انحصار کرتے چلے آ رہے ہیں، پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

یورپ اور امریکہ میں 09-2008ء میں جو بحران پیدا ہوا اس کی زوال پذیری سے عالمی معیشت کا وہ حصہ بھی جو اب تک اس کی لپیٹ میں نہیں آیا تھا زد میں آ چکا ہے۔ آج عالمی معیشت حقیقی طور پر عالمی ہو چکی ہے ایک خطے کے متاثر ہونے پر دوسرا بھی متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اب حقیقی سطح پر اس نظام کا عالمی بحران پیدا ہو چکا ہے۔

مارکسی نقطہ نظر سے ہم معاشیات کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تاہم ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ فزکس یا کیمسٹری کی طرح کی سائنس نہیں ہے جیسا کہ اینگلز نے وضاحت کی تھی۔ جزیات میں جا کر ہر چیز کی پیشین گوئی ممکن نہیں ہوتی، اس لیے تمام تر پیشین گوئیاں مشروط ہوا

کرتی ہیں، تاہم معاشی صورتحال کے چیدہ چیدہ نکات سے جو شکل سامنے آتی ہے وہ واضح ہے۔ آیا کہ یہ مندے کا ایک اور دور (یہ زیادہ ممکن نظر آتا ہے) یا کمزور شرح نمو کا طویل دورانیہ۔ صورتحال جو بھی ہو لیکن سیاسی تناظر کی بڑی شکل بنیادی طور پر یکساں رہے گی۔ مرکزی بات یہ ہے کہ لوگوں کی توقعات پوری نہیں ہوں گی بلکہ اور زیادہ تنزلی طرف جائیں گی۔

طبقاتی جدوجہد پر اس کے اثرات

اس ساری صورتحال میں ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپ صورتحال یہ ہے کہ اس کے طبقاتی جدوجہد پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اس میں اہم ترین بات یہ ہے کہ معاشی استحکام اور توازن کے لیے بورژوازی کی تمام تر کوششیں سماجی اور سیاسی توازن کو تباہ کر دیں گی۔ مثال کے طور پر پرتگال کو دیکھ لیں جہاں گزشتہ ستمبر اکتوبر میں چلنے والی تحریک اس قدر طاقت ور تھی کہ چند سوالات پر ہی اس نے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تحریک 1974ء کے انقلابی مظاہروں سے بڑی تھی جنہوں نے آمریت کو اکھاڑ پھینکا تھا۔

ان حالات میں کون سنجیدگی سے کہہ سکتا ہے کہ کوئی طبقاتی جدوجہد بھی نہیں ہے اور بحران بھی نہیں ہے! جنوبی یورپ، جہاں معیشتیں کمزور ہیں، میں سے ہی اس بحران کی شروعات ہوئی۔ جب اٹلی کا دراغی یہ کہتا ہے کہ ''ہم یورو کو بچا لیں گے'' تو اس سے اس کی مراد اٹلی کی کرنسی نہیں ہوتی بلکہ وہ جرمنی کے کردار کا حوالہ دے رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ جرمنی ہی ہے جو کہ ہر فیصلہ کرتا ہے۔ جب مشترکہ منڈی کا قیام عمل میں آیا تھا تو یورپی یونین کے چلانے والوں کے قطعی یہ ارادے نہیں تھے۔ فرانس نے سوچا کہ معاملات کے معاشی پہلوؤں کو جرمنی کی طرف منتقل کر دیا جائے گا اور وہ سیاسی معاملات کو سنبھالے گا۔ یہ سب حقیقت حال سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ بانس کی قیمت دینے والا ہی اس میں سے سُر نکال سکتا ہے۔ یورپ کا معاشی مرکز جرمنی ہے اور اسی کی بورژوازی ہی سارے فیصلے کرتی ہے۔ چنانچہ فرانس اب یورپ کا دوسرے درجے کا

ملک بن کے رہ گیا ہے۔اس صورتحال میں فرانس اپنی جو تجویز لے کے آرہا ہے وہ یہ کہ یورو بانڈز جاری کیے جائیں۔بانڈز کا اجرا کسی ملک کا انفرادی فعل نہیں ہوگا بلکہ یہ یوروزون کا اجتماعی عمل ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جرمنی کی طاقتور معیشت کے بل بوتے پر یہ بانڈز جاری کئے جائیں۔جرمنی تبھی اس پہ راضی ہوگا کہ جب اسے دوسرے ملکوں کے بجٹوں پر کنٹرول حاصل ہوجائے۔اگر یورپی یونین مما لک کے قرضے جرمنی نے ادا کرنے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ان ملکوں کے اخراجات پر بھی نظر رکھے۔وہ دیکھے کہ اخراجات کہاں اور کس طرح کیے جارہے ہیں۔اس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ دوسرے ملک اپنی خودمختاری جرمنی کے قدموں تلے رکھ دیں۔فرانس اس کیلئے کبھی بھی تیار نہیں ہوگا۔

اس سارے کھیل میں برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون کا کردار ایک مسخرے کا ہے۔جو اس سوال کیلئے ریفرنڈم کی حمایت کر رہا ہے کہ کیا برطانیہ کو یورپی یونین میں رہنا چاہئے یا چھوڑ دینا چاہئے؟اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں کنزرویٹو کی غیر مقبول ہوچکی پوزیشن کو سنبھالا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔برطانیہ میں یونائٹڈ کنگڈم انڈیپنڈنٹ پارٹی(UKIP) نے رائے سازی کے دوران کنزرویٹو کے ووٹ بھی حاصل کر کے اپنی پوزیشن بہتر کرلی ہے۔اس نے یورپی یونین مخالف موڈ کو کنزرویٹو پارٹی کے ایک حصے میں ابھارا جو کہ قومیت کے جذبات میں آکر اس کی حمایت کر رہا تھا۔کیمرون ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے کیونکہ اس سے بیک وقت برطانیہ بھی مستقبل میں یورپی یونین سے کٹ جائے گا اور یہ یورپی سرمایہ داری کیلئے بھی تباہ کن ثابت ہوگا۔

اصلاح پسندوں کا کردار

ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ دھوکہ دہی، ہر قسم کی اصلاح پسندی بالخصوص لیفٹسٹ اور سنٹرسٹ اصلاح پسندوں کا موروثی وصف ہے۔چونکہ محنت کش طبقہ انہیں اپنا ''ساتھی'' سمجھتے ہوئے ان پر اعتماد کرتا ہے۔جب یہ اصلاح پسند پارٹیاں محنت کشوں کو دھوکہ دیتی ہیں تو طبقہ ان کے خلاف شدید غم وغصے کا اظہار کرتا ہے۔الیکشن کے موقع پر طبقہ اپنے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ان

سے منہ موڑ لیتا ہے جیسا کہ ہم یورپی ملکوں میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ اسی بات کا ہی اظہار ہے۔ اس دوران کہ جب ہم مارکس وادی لیفٹ کی پارٹیوں کے رول کو جانچ رہے ہوتے ہیں، جیسا کہ یونان میں SYRIZA کے لیڈر سپراس وغیرہ، ایسا کرتے ہوئے ہمیں کسی طور بھی جذباتی طریقہ کار نہیں اپنانا چاہئے۔ مارکس وادی کسی بھی واہمے سے بچتے ہوئے اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ یہ قائدین عوامی دباؤ کے زیر اثر بائیں بازو کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ لیکن پھر یہی بورژوازی کے دباؤ تلے واپس دائیں بازو کی طرف بھی لڑھک جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس سرمایہ داری کے متبادل کسی حل یا پروگرام کی کوئی تیاری نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے عوام پر بحران کے بدترین اثرات کے خاتمے کے امکانات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ پس یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے شکست وریخت کا شکار ہو جاتے ہیں یا پھر عوامی دباؤ برداشت نہ کرتے ہوئے ریاستی مشینری کے ہاتھوں کھلونا بن جائیں۔

یہاں ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ بورژوا جمہوریت اپنے اندر کوئی مستقل شے نہیں ہوتی کہ جسے تبدیل بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس کا وجود کئی شرائط کے تابع ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں محنت کشوں کو کچھ رعایتیں دینا بھی شامل ہوتا ہے۔ اصلاح پسند پارٹیوں کی کسی قدر مضبوطی اور عوام پر ان کے اثرات بھی انہی شرائط میں شامل ہوتے ہیں۔ جب تک اس قسم کی پارٹیاں اور ان کے قائدین اپنی اتھارٹی قائم رکھتے ہیں، وہ محنت کشوں کو روکے رکھنے اور انہیں ایک حد کے اندر رہنے کے سامان پیدا کرتی رہتی ہیں۔ تاہم ایک بار جب یہ اقتدار کے قریب پہنچتی ہیں یا پھر عوام کا دباؤ انہیں حکومت تک لے آتا ہے تو پھر ان کا اصلی رنگ ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یونان میں بھی PASOK کے ساتھ یہی ہوا۔ ان اصلاح پسند قائدین کی عوام کو روکنے اور انہیں حدود میں رکھنے کی صلاحیتوں کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ یہاں ہم ٹراٹسکی کے 1938ء کے مؤقف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ''یہ نظام کا نامیاتی بحران ہے۔'' لیکن 1920ء اور 1930ء کے عشرے اور موجودہ حالات میں بہت فرق ہے۔ آج یورپ کے مقتدر طبقے کو زیادہ سنجیدہ مسائل کا سامنا ہے۔

بوناپارٹ ازم کے عناصر

محنت کش ایک طویل عرصے سے پنشنوں، مفت تعلیم، علاج معالجے اور ایک خاص معیار زندگی کے عادی ہو چکے ہیں اور اب وہ ان سے بھی آگے کی توقع رکھتے ہیں جو انہیں ماضی میں نہیں ملی تھیں۔ جبکہ بورژوازی ان سے پہلے دی گئی مراعات اور اصلاحات کو بھی واپس لے لینا چاہتی ہے جو گزشتہ ساٹھ سالوں سے محنت کشوں کو میسر آ رہی تھیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یورپ میں محنت کش طبقہ کبھی بھی اتنا مضبوط نہیں رہا۔ 1930ء کے عشرے میں طاقتوں کا توازن بھی مختلف تھا۔ تب مقتدر طبقے فوری ردعمل اور فاشزم کی طرف بھی مائل ہو جاتے تھے۔ لیکن موجود حالات میں ان کیلئے ایسا ممکن نہیں رہا۔

یونان میں گولڈن ڈان مستقبل کیلئے ایک خطرہ ہے لیکن اس قسم کی طاقت کیلئے مستقبل قریب میں اقتدار میں آنے کے کوئی امکان نہیں ہیں۔ ردانقلاب کی طاقتیں صرف محنت کش طبقے کی پے در پے شکستوں کے بعد ہی اقتدار میں آ سکتی ہیں۔ اس وقت محنت کش طبقے کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے۔ اس وقت حقیقت یہ ہے کہ پارلیمانی بوناپارٹ ازم کے عناصر بھی صورتحال میں در آ چکے ہیں۔ اٹلی میں مونٹی الیکشن کی بجائے براہ راست مسلط کر دیا گیا۔ یہی حال یونان میں پاپا ڈیموس کا ہے۔ ہمیں صورتحال میں بوناپارٹ ازم کے عناصر کارفرما ہوتے نظر آ رہے ہیں کہ جہاں اصلی فیصلے پارلیمنٹ کی بجائے کوئی مخصوص اقلیت کر رہی ہے۔ یوں ہم بوناپارٹ ازم کا رجحان دیکھ رہے ہیں لیکن یہاں اس مرحلے پر بوناپارٹ ازم آمریت کا سنجیدہ خطرہ محسوس کرنا غلط ہوگا۔

بورژوازی، محنت کش طبقے کی عوامی اصلاح پسند پارٹیوں کی جانب ملتفت ہو رہی ہے۔ ہر جگہ قومی اتحاد اور قومی مفاہمت کی حامل حکومتوں کا غلغلہ سنائی دے رہا ہے۔ قومی اتحاد ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔ محنت کشوں کے مفادات کو بینکاروں کے مفادات اور بیروزگاروں کے مفادات کو افسر شاہی کے مفادات کے ساتھ یکجا سمجھنا اور کرنا ہی ناممکن ہوتا ہے۔ البتہ موجودہ گہرے ہوتے بحران اور کسی طبقاتی متبادل کی غیر موجودگی کی کیفیت میں اس قسم کے نعرے اور نظریے میں بہت بڑے فریب کارفرما ہوتے ہیں۔ اس نعرے اور نظریے سے کام چلانے کی کوشش کی جائے گی۔

میڈیا کے ذریعے یہ واویلا کیا جائے گا کہ ''ہم سب وسیع تر قومی مفاد میں یکجا ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہر جگہ ہر طرف ایک گہری طبقاتی تقسیم موجود ہے اور اصلاح پسند قیادت کی جانب سے کی جانے والی دھوکہ دہی کے باوجود طبقاتی جدوجہد مختلف کیفیتوں اور حالتوں میں ہر جگہ ابھر رہی ہے۔

یونان

یونان میں مثال کے طور پر ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا سکینڈل سامنے آ رہا ہے۔ تازہ ترین ٹیکسوں کی چوری کا ہے۔ پاسوک کے قائد اور سابق وزیر مالیات وینی زیلوس کی بیوی بھی اس میں ملوث ہے۔ ٹیکس چوروں کی فہرست میں یہ خاتون بھی شامل ہے۔ اس فہرست میں امیر ترین لوگ شامل ہیں جو کہ سوئس بینکوں میں کروڑوں جمع کروا کے مزے لوٹ رہے ہیں جبکہ دوسری طرف کروڑوں عوام فاقہ کشی کی حالت کو پہنچ چکے ہیں۔ اس صورتحال نے عوامی غیض وغضب کو بھڑکا کے رکھ دیا ہے اور سیاستدانوں کے خلاف عوام کا غم وغصہ ابل رہا ہے۔ یورپ کے لاغر ترین ملکوں میں سے یونان کی حالت سب سے پتلی ہو چکی ہے۔ ظالمانہ کٹوتیوں کو مزید لاگو ہونے سے روکنے کیلئے یونان کے محنت کش اور نوجوان بھرپور مزاحمت کر رہے ہیں۔ یہاں اب تک 21 عام ہڑتالیں ہو چکی ہیں۔ جبکہ جزوی اور علاقائی ہڑتالوں کا سلسلہ بھی جاری وساری ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ٹریڈ یونین لیڈر جدوجہد کو بڑھانے کیلئے عام ہڑتال کی کال نہیں دیتے۔ بلکہ وہ عام ہڑتالوں کو غم وغصے کے نکاس کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس سے نیچے ورکروں میں مایوسی پھیلتی ہے اور وہ کام پر واپس چلے جاتے ہیں۔ بورژوازی اس کیفیت سے پوری طرح باخبر ہے۔ تبھی تو وہ بے رحمی اور ڈھٹائی سے مسلسل کٹوتیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

تاہم اب لوگ اس سب سے اکتانا شروع ہو چکے ہیں۔ اب انہوں نے بھی صورتحال سے سیاسی نتائج اخذ کرنا شروع کر دیے ہیں۔ SYRIZA کا ایک چھوٹی سی بائیں بازو کی پارٹی سے ابھر کر بڑی پارٹی بن جانا اس کی واضح عکاسی ہے۔ تاہم جب یہ ایک دفعہ حکومت میں ہو گی تو اس پر

بورژوازی کا شدید دباؤ ہوگا کہ یونان کا قرضوں کا بوجھ کم کرنے کیلئے ضروری کٹوتیاں کرے۔ یوں یہ پارٹی بھی ایک آزمائش میں آجائے گی۔ یہ ایک طرف یونان کے محنت کشوں اور نوجوانوں کے مشترکہ ومتضاد دباؤ میں آجائے گی اور دوسری طرف سرمایہ داروں کا بھی اس پر سخت دباؤ ہوگا۔ مارکس وادیوں کو اس ساری کیفیت کا معروضی تجزیہ کرنا ہوگا۔ مارکس وادی سطحی لغزشوں میں نہیں پڑتے اور نہ ہی خوش فہمی کے وقتی اور عارضی موڈ کو خود پر غالب ہونے دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا رویہ تنقیدی ہے۔ ہماری اس تنقیدی حمایت کا مطلب یہ ہے کہ ہم SYRIZA کی تعمیر وترقی کیلئے کیے گئے اقدامات کو اپنی حمایت فراہم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم اس کے پروگرام اور پالیسیوں کے نقاد بھی ہیں۔ جیسے جیسے پارٹی دباؤ میں آئے گی ہمارا انداز مزید ناقدانہ ہوتا جائے گا اور ہم غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنا متبادل بھی سامنے لاتے رہیں گے۔

ہمیں کسی طور نہیں بھولنا چاہئے کہ اصلاح پسندی میں عوامی خواہشات کی عدم تکمیل کا عنصر موروثی ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک قانون ہے۔ یہاں ہم ایک پیشین گوئی کرتے ہیں وہ یہ کہ اس پارٹی کا لیڈر سپراس جتنا بھی اقتدار کے قریب ہوتا چلا جائے گا اتنا ہی یہ معتدل ہوتا جائے گا۔ یونان کے مارکس وادیوں پر یہ فرض بنتا ہے کہ وہ محنت کشوں اور نوجوانوں کو SYRIZA کے اندر اور باہر مربوط کریں اور ایک انقلابی مارکسی پروگرام ان کے سامنے رکھیں کہ جس کی بدولت ہی SYZIRA اس قابل ہوسکے گی کہ وہ محنت کشوں اور نوجوانوں کی خواہشات کی تکمیل کرسکتی ہے۔ وگرنہ پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد اس کی قیادت عوام کو سخت مایوس کرے گی۔ یہ وقت کے خلاف لڑائی ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ وزیراعظم سماراس کی قیادت میں چلنے والی موجودہ حکومت زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ لیکن اسی دوران مارکس وادیوں کو بے صبرا اور بیتاب نہیں ہونا چاہئے۔ ایک مخصوص ماحول ہے ویسا ہی جیسا کہ طوفان سے پہلے کی مشہور خاموشی کا ہوتا ہے اور جس کے بعد طوفان اچانک پھٹ پڑتا ہوتا ہے۔ چپ کا یہ ماحول کسی طور بھی سکون بخش نہیں ہوا کرتا۔ اس سے غلط نتیجے بھی اخذ ہوسکتے ہیں، اس کی صاف وضاحت بھی ممکن نہیں ہوا کرتی۔ لیکن پھر یوں ہوتا ہے کہ طوفان اچانک پوری وحشت کے ساتھ سروں پر آپہنچتا ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کدھر سے

کہاں سے آیا ہے؟ ہم ابھی اس مرحلے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں لیکن یاد رہے کہ طوفان ابھی چھٹا نہیں ہے اور یہ بات بھی یاد رہے کہ طوفان ہماری یا کسی کی بھی اجازت لے کر کبھی نہیں آیا کرتا۔

اس کا انحصار نیچے سے تحریک کے پھوٹنے پر ہے۔ محنت کش اس وقت حرکت کریں گے جب وہ اس کیلئے تیار ہوں گے، جب وہ سمجھ جائیں گے کہ بس اب حد ہو چکی ہے اور جب وہ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اب انہیں ہر حال میں اپنی تقدیر کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھوں میں لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس تمام عمل میں عوامی تنظیموں جن میں ورکروں کی پارٹیاں اور ٹریڈ یونینیں دونوں شامل ہیں، کا کردار بہت فیصلہ کن ہوگا۔ ان کی بنیاد اور قیام کا مقصد محنت کشوں کے مفادات کی رہنمائی نمائندگی اور دفاع کرنا ہوتا ہے۔ لیکن پچھلے کئی عشروں سے یہ عوامی تنظیمیں ایک ایسے مرحلے سے گزر رہی ہیں جہاں ان کی قیادتیں نظام کے ساتھ مطابقت اور سمجھوتے کر چکی ہیں اور نظام سے فائدے اٹھا رہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں یہ قیادتیں خود کو محنت کش طبقے کے ہراول لڑاکا دستے کے طور پر نہیں دیکھتیں بلکہ ایک صلح جو مفاہمت پسند کے طور پر دیکھتی ہیں جو سماج میں امن وسکون کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ خود کو ایک ایسے عملیت پسند اور حقیقت پسند کے طور پر دیکھتے ہیں جو نظام کے اندر رہتے ہوئے محنت کشوں کو کچھ نہ کچھ دینے دلانے میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن ان قائدین کو اس وقت ایک مسئلے نے گھیرا ہوا ہے اور وہ یہ کہ سرمایہ داری کے عالمگیر بحران کی موجودہ کیفیت میں نہ تو رعایات جیتی جاسکتی ہیں نہ ہی کوئی حقیقی نوعیت کی اصلاحات کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اب ان کو چاروناچار کٹوتیوں اور رد اصلاحات کو قبول اور نافذ کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے، چنانچہ اس وقت ان کا کردار بالکل مختلف اور الٹ نوعیت کا ہو چکا ہے۔

اس قسم کی کیفیات میں فرقہ پرست لیفٹسٹوں کی جانب سے یہ کہنا انتہائی آسان ہو جاتا ہے کہ ''لیبر قیادت اپنی اتھارٹی سے یکسر محروم ہو چکی ہے۔'' شومئی قسمت بات اتنی سادہ بھی نہیں ہے۔ یہ عوامی تنظیمیں ایک لمبے عرصے سے چلی آ رہی ہیں جو کہ ایک روایت کے طور پر مستحکم ہو چکی ہیں اور ان کی جڑیں طبقے میں موجود ہیں۔ محنت کش طبقہ آسانی سے اپنی ان تنظیموں سے جان نہیں

چھڑاتا۔ کیونکہ وہ سالوں اور عشروں کے دوران ہونے والی ماضی کی جدوجہد کے دوران اسے تعمیر کر چکے ہوتے ہیں۔ ان سے جان چھڑانے کیلئے بڑے واقعات کے سلسلہ وار جھٹکے درکار ہوتے ہیں جو اس قسم کی تنظیموں اور قیادتوں پر طبقے کے اعتماد کو اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔

جو کچھ اب ہوگا وہ کسی طرح بھی 1930ء کی دہائی جیسے واقعات وحالات کا ایکشن ری پلے نہیں ہوگا۔ ہمیں بلاشبہ ٹراٹسکی کی تحریریں پڑھنی چاہئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں طریق کار کو بھی لازمی سیکھنا چاہئے، اسی طرح اسباق کو بھی تاکہ ہم ٹراٹسکی کی لکھتوں کو مشینی انداز میں منطبق کرنے سے بچ سکیں۔ تاریخ درحقیقت اپنے آپ کو کبھی بھی میکانکی انداز میں نہیں دہرایا کرتی۔ بہت سے متغیر عوامل ہوتے ہیں جنہیں سمجھنا ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔

سپین

سپین شاید یونان کے بعد یورپ کا دوسرا بڑا مریض ملک ہے۔ وقتی طور پر ایسا لگ رہا تھا کہ یورپی یونین کے تعاون سے سپین اپنی صورتحال کو مشکلات سے نکال اور سنبھال چکا ہے، لیکن اس وقت بھی بانڈز پر شرح منافع 5 فیصد سے زائد ہے جو خطرناک حد تک زیادہ ہے۔ معاشی نمو رکی ہوئی ہے اور تازہ ترین اعداد وشمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ صورتحال بد سے بدترین ہوتی جارہی ہے۔ 2012ء کی آخری سہ ماہی میں پیداوار اپنی پچھلی سہ ماہی سے 0.7 فیصد نیچے چلی گئی ہے۔ جبکہ مجموعی طور پر سارے سال کے دوران ترقی کی شرح پچھلے سال کے مقابلے میں 1.8 فیصد گری ہے۔ یہ عالمی بحران کے شروع ہونے کے بعد سے سپین کی بدترین پرفارمنس ہے۔

جتنی زیادہ کٹوتیاں ہوں گی اتنا ہی لوگوں کی قوت خرید کم ہوگی۔ یہ پستی کی طرف جانے والی گردش ہے۔ کیونکہ زیادہ کٹوتیاں منڈی کو زیادہ کمزور کردیں گی اور منڈی کو مضبوط کرنے کیلئے جو حل دیا اور کیا جارہا ہے وہ کٹوتیاں ہی کٹوتیاں ہیں۔ گزشتہ عرصے میں جب بڑے پیمانے پر کریڈٹ شروع کیا گیا تو اس نے ہاؤسنگ کے ایک بہت بڑے بلبلے کو جنم دیا جس کے پھٹ جانے کے بعد یہ ساری صورتحال پیدا ہوئی۔ سپین کے محنت کش اور نوجوان اب ہر اس چیز کی تباہی

دیکھ رہے ہیں جس کیلئے وہ ماضی میں جدوجہد کرتے رہے ہیں۔اب نیچے سے ایک دباؤ بن اور بڑھ رہا ہے۔جریدہ ''اکانومسٹ'' نے حال ہی میں ایک سوال اٹھایا ہے کہ ''کیا سپین کے لوگ اس بڑھتے ہوئے کرب کو برداشت کرسکیں گے؟ یا وہ اس سیاسی انتظام کے خلاف بغاوت کردیں گے کہ جو اس کرب کی ذمہ دار ہے!'' یہی قریب قریب خلاصہ ہے جو سپین کا بنتا ہے اور جو کچھ سپین کے بارے کہا جارہا ہے وہی اس وقت سارے یورپی ملکوں کے بارے درست ہے۔

سپین ایک پریشر ککر بن چکا ہے۔جس کا پریشر پھٹنے جارہا ہے۔جریدے El Pais کے ایک سروے پول کے مطابق لوگوں سے پوچھا گیا کہ'' کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ بڑھتی ہوئی غربت اور بیروزگاری کے باعث ملک پھٹ سکتا ہے؟'' تو 73 فیصد لوگوں نے کہا کہ ''ہاں''۔ایک اور سوال یہ تھا کہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ بحران سیاسی قیادت پر بداعتمادی کے درجے کو بڑھا رہا ہے تو 97 فیصد نے اس سے اتفاق کیا۔مزید پوچھا گیا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ سماج کی سبھی پرتیں اس بحران میں اپنا حصہ مساوی طور پر نہیں ڈال رہیں اور یہ کہ اس کے برے اثرات دوسروں کی نسبت متوسط طبقے اور محدود ذرائع آمدنی والوں پر زیادہ مرتب ہو رہے ہیں۔96 فیصد نے تائید کی۔ایک اور سوال یہ بھی کیا گیا کہ کیا آپ اتفاق کرتے ہیں کہ اگر خیراتی ادارے نہ ہوتے تو سماجی بحران اتنی دیر تک برقرار نہ رہ سکتا۔

بورژوا جمہوری اداروں پر لوگوں کا اعتبار نہیں رہا۔لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان سے ایسے بحران کی قیمت وصول کی جارہی ہے جسے پیدا کرنے میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں۔جبکہ اس دوران امیر پہلے سے بھی زیادہ امیر ہوتے چلے جارہے ہیں۔یہ کیفیت سماج کو پھٹنے پر مجبور کررہی ہے۔ سپین میں اس وقت یہی حقیقت ہے۔

سپین میں برسراقتدار پارٹی P P کو الیکشن میں 29 فیصد ووٹ حاصل ہوئے تھے۔پچھلے انتخابات سے یہ 43 فیصد کم ہیں۔سوشلسٹ پارٹی کو 23 فیصد ووٹ ملے جو پہلے سے 5.4 فیصد کم تناسب ہے۔یونائیٹڈ لیفٹ نے 11 فیصد تک چھلانگ لگائی ہے۔تناسب میں یہ اضافہ نومبر 2011ء سے 5.6 فیصد کا ہے، جو کہ دوگنا سے بھی زیادہ ہے۔صدر را

جوئے پر عدم اعتماد کرنے والوں کی تعداد 84 فیصد ہے۔(اسی وجہ سے اس میں PP کے بہت سے حامیوں کی تعداد بھی شامل ہے)حزب اختلاف ''سوشلسٹ پارٹی'' پر بھی 91 فیصد عوام کا عدم اعتماد ہے۔ الیکشن جنوری 2012ء کے آغاز میں ہوئے تھے اور اب تک بدعنوانی کے بہت سے سکینڈل سامنے آ چکے ہیں اور اس میں حزب اقتدار بھی ملوث ہے۔ یہ نہ صرف اس حکومت کے لیے بلکہ تمام بورژوا جمہوریت کے لیے بھی اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوگا اور یہ بالآخر اپنا کنٹرول ختم کر بیٹھیں گے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اس سب کو مرتکز کرنے کے لیے کوئی راستہ نہیں۔ عوامی پارٹیوں اور ٹریڈ یونینز سے باہر ہی کئی بڑی تحریکیں ابھر چکی ہیں۔ Indagnados جیسی تحریکیں اس طرف کا اشارہ ہیں جو آنے والے وقتوں میں ہونے والا ہے۔ میڈرڈ میں نجکاری کے خلاف ابھرنے والی تحریک بھی ''سرکاری'' عوامی اسمبلیوں اور انتظامی کمیٹیوں وغیرہ سے باہر ہی نمودار ہوئی تھی۔ ایک مقام ایسا بھی آیا تھا کہ 47 ہسپتالوں پر محنت کشوں، لاکھوں احتجاجی ہڑتالیوں اور ڈاکٹروں نے قبضہ کر لیا تھا۔

سپین درحقیقت انارکزم کی روایات کا ملک ہے، منظم طور پر تو نہیں بلکہ انارکسٹ تنظیمیں کم ہو کر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ یہاں نیچے سے خودرو بغاوتیں تحریکوں کی صورت میں ابھر رہی ہیں اور یہی اٹلی کے بارے میں بھی درست ہے۔ ایک خاص مقام پر ہسپانوی محنت کش اور نوجوان اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ''بس اب بہت ہو چکا!'' اصلاح پسند لیڈر محنت کشوں کا راستہ روکنے اور انہیں پیچھے دھکیلنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ایک بار جب حالات ناقابل برداشت سطح تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر لیڈرز اس کو پیچھے نہیں دھکیل سکتے، ایک بار تحریک پھوٹ پڑتی ہے تو اس کی کیفیت اس گاڑی جیسی ہوتی ہے جو پہاڑ سے نیچے آ رہی ہے اور اس کی بریکیں فیل ہو چکی ہوں۔ ہمیں یہ بات سمجھنی ہوگی کہ 'اس وقت' عوامی تنظیموں کے لیڈر سماج میں حقیقی صورتحال کی عکاسی نہیں کر رہے، فیکٹریوں، مزدوروں اور عوام میں موجود غصے کا اظہار نہیں کر رہے۔ یہ بنیادی تضاد ہے جس کا ہم اس وقت سامنا کر رہے ہیں۔ بہرحال صورتحال ہمیشہ

ایسی نہیں رہ سکتی۔ اسے حل ہونا ہوگا اور یہ ضرور ہوگی۔ ابتدا میں ہم نیچے ابھرنے والی خودرو تحریکیں دیکھیں گے۔ یہ تحریکیں جو مزدور تحریک میں موجود اصلاح پسند لیڈروں کے خلاف ابھریں گی، ان کے عوامی تنظیموں اور ٹریڈ یونینز پر بڑے اثرات مرتب ہوں گے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ سپین میں پرانی روایات واپس آ رہی ہیں۔ گزشتہ سال موسم سرما میں چلنے والی کان کنوں کی شاندار تحریک اس کا ثبوت ہے۔ یہی وہ علاقے ہیں جہاں سے اب تحریک کا آغاز ہوا اور یہی 1930ء کے ہسپانوی انقلاب کے مراکز تھے۔ ہمیں اب ''باقاعدہ ہڑتال'' نہیں بلکہ خانہ جنگی کی خصوصیات دیکھنے کو ملیں گی، گولیوں اور راکٹوں سے پولیس اور بیرکوں پر حملے، پولیس کے چھاپے اور اس کے مار پیٹ وغیرہ کے مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔

پولیس کا تشدد ہر جگہ بڑھ رہا ہے۔ یہ سکے کا دوسرا رخ ہے۔ اصلاح پسند لیڈران محنت کشوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب یہ ناکام ہو جاتے ہیں اور انہیں مجبوراً تحریکوں کی قیادت بھی کرنا پڑ جاتی ہے تو پھر ریاست کے پاس عوام کو ڈرانے کے لیے بے رحمانہ پولیس تشدد کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن اس سے الٹ اثرات مرتب ہوتے ہیں اور لوگوں کو بورژوا ریاست کی حقیقی شکل کو سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

جب کان کن رات کے 2 بجے میڈرڈ پہنچے تھے تو دو لاکھ لوگوں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ انہوں نے 1930ء کی دہائی کے انقلابی گیت گائے۔ یہ ایک بہت جذباتی، بہت طاقت ور لمحہ تھا، لوگ رو رہے تھے۔ ہمیں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لینا چاہیے، لیکن یہ علامات ہیں کہ محنت کشوں اور نوجوانوں کا شعور واقعات کی بنیاد پر تبدیل ہو رہا ہے۔ پورے سپین میں چھوٹی ہڑتالوں اور احتجاجوں کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

سپین میں سارے پرانے دیو بھی واپس آ رہے ہیں۔ Basque اور Catalan کی خودمختاری کی تحریکیں بھی دوبارہ ابھرتی نظر آ رہی ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے ایک گہرا عمل بھی جاری ہے کہ لوگ ان ''خودمختاری کے حق میں'' ہونے والے احتجاجوں میں حصہ لے کر خودمختاری کی بجائے ہسپانوی کٹوتیوں کے خلاف احتجاج کرتے نظر آ رہے ہیں۔

14 نومبر کو ہونے والی عام ہڑتال میں سپین کی حقیقی صورتحال کھل کر سامنے آئی تھی، جس کی کال پورے یورپ کی ہڑتال کے طور پر دی گئی تھی۔ البتہ یہ صحیح معنوں میں پورے یورپ کی ہڑتال تو ثابت نہیں ہو سکی لیکن سپین میں اس کا شاندار جواب دیکھنے کو ملا۔ قوم پرستوں کی جانب سے بہت انقلابی اور بائیں بازو کے طرز کی تقاریر سننے کو مل رہی ہیں لیکن عملاً ان کا کردار اس کے برعکس ہی ہے۔ مثلاً اگر ایک ''ہسپانوی'' ہڑتال کی کال دی گئی ہے تو Basque قوم پرست مختلف مقاصد کے لئے ہڑتال کی کال دیتے ہیں۔ لیکن نیچے لوگ اس سے خوش نہیں ہیں۔ وہ اپنی جبلت میں طبقے کے اتحاد کی ضرورت کو سمجھتے ہیں اور ایک بار جب محنت کش طبقہ حرکت میں آتا ہے تو یہ قومی سوال کو بھی کاٹ دیتا ہے۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے غصے اور جدوجہد کی مقدار کو دیکھا جا سکتا ہے۔ 2012ء کے پہلے دس مہینوں میں احتجاج کرنے والوں کی تعداد 36000 تھی جو کہ 2011ء کی بہ نسبت دوگنا زیادہ ہے۔ کوئی کیسے اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اب سپین میں انقلاب سے پہلے ہونے والی کیفیت کے شعلے موجود ہیں!

اس بندگلی میں لانے کا الزام سپین کی سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹی کے سر جاتا ہے۔ محنت کش 1976ء کی نام نہاد ''عبوری جمہوریت'' کے وقت ہی اقتدار اپنے ہاتھوں لے سکتے تھے۔ حقیقت میں یہ ایک بیہودہ سودا تھا جس نے بادشاہت، سول گارڈز اور کیتھولک چرچ وغیرہ جیسے ماضی کے سبھی عناصر کو اپنے ساتھ ملائے رکھا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جتنی رقم آج کیتھولک چرچ کو دی جا رہی ہے، وہ پنشنوں اور صحت کے شعبے میں کی جانے والی کٹوتیوں کی رقم کے برابر ہے۔ آج بادشاہت کے خلاف ہونے والی جدوجہد طبقاتی جدوجہد کا ایک اہم عنصر بن سکتی ہے اور بادشاہت کے خاتمے کے مطالبات عبوری مطالبات کا ایک اہم حصہ بن سکتے ہیں۔

اٹلی

اٹلی ایک ایسا ملک ہے جہاں شدید انتشار موجود ہے۔ بورژوازی کو وہاں ظالمانہ کٹوتیوں کے اقدامات کرنے کی ضرورت درپیش ہے جس سے محنت کشوں کی کم سے کم معیار کی ایک مہذب زندگی گزارنے کی سبھی چیزیں برباد ہو جائیں گی۔ لیکن برلسکونی مسائل پیدا کر رہا ہے کیونکہ وہ صرف اور صرف اپنے ذاتی مفادات کا دفاع کر رہا ہے بجائے اس طبقے کے مفادات کے جس سے وہ تعلق رکھتا ہے۔ اپنی انتخابی حمایت کو دوبارہ جیتنے لیے اس نے جاتی ہوئی مونٹی حکومت کا لگایا گیا پراپرٹی ٹیکس ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ بورژوازی لازماً اس مسخرے کی حرکتوں پر اپنے بال ہی نوچ رہی ہوگی۔ بورژوازی کے نقطہ نظر سے منڈیوں کو ٹھنڈا کرنے اور انہیں یقین دلانے کے لیے کہ اٹلی اپنے قرضے چکا سکتا ہے، اس کیلئے صرف اور صرف کٹوتیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اٹلی کو ایک دھماکہ خیز صورتحال کی جانب دھکیل رہا ہے، ایک خاص مقام پر اٹلی کے محنت کش، ہسپانوی محنت کشوں کی طرح طبقاتی جدوجہد کے میدان میں اتریں گے اور جس کے ساتھ ہی ماضی کی تمام پرانی روایات بھی لوٹ آئیں گی۔

ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر اور اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے وہ کافی دلچسپ ہے۔ ہاں یہ ایک بورژوا پارٹی ہے لیکن اس کی اپنی ایک مخصوص طرز ہے۔ محنت کشوں کی بڑی تعداد اس کے اندر ماضی کی روایت کمیونسٹ پارٹی کے حصے کو دیکھتے ہیں۔ اس کے اب بھی براہ راست کچھ ٹریڈ یونینوں کے ساتھ اہم تعلقات ہیں۔ جب کٹوتیاں لاگو کی جائیں گی تو اسے محنت کشوں کو روکنے کے آلے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ ٹریڈ یونین لیڈر سوچتے ہیں کہ نئی حکومت جس کی قیادت ڈیموکریٹک پارٹی کرے گی، وہ ان کے سبھی مسائل حل کر دے گی۔ وہ اسے ایک ایسی حکومت کے طور پر دیکھتے ہیں کہ جس سے حتمی طور پر یہ مذاکرات کر سکتے ہیں۔ وہ بہت جلدی ہی یہ بات سمجھ جائیں گے کہ چاہے کوئی بھی اقتدار میں آئے پروگرام ویسا ہی رہنا ہے۔ ایسے ٹریڈ یونین لیڈرز ہونے کے باوجود بھی اٹلی میں محنت کشوں کی روایات پھر سے ابھر رہی ہیں۔ Sardinia کے صوبے میں ہی دیکھ لیں جہاں کان کنوں کا غصہ ہی اتنا تھا کہ حکومتی منسٹر کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے بھاگنا پڑ گیا۔

نوجوانوں نے بھی حرکت کرنا شروع کر دی ہے، متحرک طالبعلموں کی بڑی تحریکیں جیسا کہ گزشتہ سال کے آخر میں 50,000 طالب علموں نے روم میں احتجاج کیا، جس کے موڈ سے سخت غصہ اور اشتعال چھلک رہا تھا۔

اطالوی سرمایہ داری بہت گہرے اور شدید بحران کا شکار ہے۔ سیاست میں جس کا اظہار دائیں اور بائیں جانب کے مشتعل ہجکولوں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ یہ ملک سپین اور یونان جیسی منزل کی جانب ہی گامزن ہے۔ ہم علاقائی ابھار اور ہڑتالیں دیکھنے کی امید کر سکتے ہیں۔

فرانس

فرانس میں صدر اولاندے نے ابتدا میں ہر قسم کی سماجی اصلاحات کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن بحران کی حقیقت نے اسے بہت جلد ہی پیچھے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں ایک مختصر سی ہی ''سہاگ رات'' جس میں محنت کشوں اور نوجوانوں نے ''سوشلسٹ'' حکومت کو موقع دیا یہ ثابت کرنے کا کہ اولاندے کو سابق صدر سارکوزی سے بہتر ہی ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ بہت جلد ہی انہیں اس بات کی سمجھ آ گئی کہ اس حکومت سے بھی اگر وہ کچھ امید کر سکتے ہیں تو یہ بس کٹوتیاں ہی ہیں۔

جرمنی جس کی شرح نمو تیزی سے کم ہو رہی ہے اور فرانس، جس کی صورتحال اٹلی اور سپین جیسی لگنا شروع ہو چکی ہے۔ وہ دن گئے جب فرانس جرمنی سے یورپین یونین پر غلبہ حاصل کرنے کی دوڑ میں ہوا کرتا تھا۔

2005ء سے اب تک فرانس اپنے حریفوں کے مقابلے میں عالمی منڈی میں اپنا 20 فیصد حصہ کھو چکا ہے۔ جرمنی کی بہ نسبت فرانس زیادہ لمبے عرصے سے بحران کا شکار ہے۔ اولاندے نے 2014ء کے بعد بڑھوتری کا وعدہ کیا ہے جبکہ وہ ''2013ء کو ایک مشکل سال'' کہہ رہا ہے۔ لیکن یہ بڑھوتری آئے گی کہاں سے؟ اگر ایک فیصد یا ڈیڑھ فیصد بڑھوتری آتی بھی ہے تو اس سے محنت کشوں کی زندگیوں پر کیا اثر پڑے گا؟

اولاندے مشکل میں ہے اور یہ تیزی سے اپنی حمایت کھو رہا ہے۔ اس نے اپنی الیکشن مہم کے

دوران کٹوتیوں کے خلاف مہم کی تھی۔اب وہ سارکوزی کی تجاویز سے بھی زیادہ کٹوتیاں کر رہا ہے، لاکھوں یوروز کی کٹوتیاں جس سے کچھ بھی حل نہیں ہونا۔فرانس کی صنعت بھی بحران کا شکار ہے۔اس کے نتیجے میں غم وغصے کا موڈ تیزی سے بڑھ رہا ہے اگرچہ یہ ابھی اپنا اظہار ہڑتالوں کی شکل میں نہیں کر رہا ۔لیکن ایسی صورتحال میں ہڑتالیں بھی بمشکل کوئی مسئلہ حل کرایا کرتی ہیں بہت سے محنت کش یہ سمجھ چکے ہیں کہ اس وقت چند ایک ہڑتالوں سے زیادہ کچھ اور کرنے کی ضرورت ہے۔چنانچہ کیفیت ایک حل کی طرف بڑھ رہی ہے۔نیشنلائزیشن کا نعرہ دوبارہ سے فرانس کی مزدور تحریک میں ابھر رہا ہے۔یہاں تک کہ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی اس نعرے سے ''محبت'' ہونی شروع ہوگئی ہے۔ دہائیوں سے ورکرز پارٹیوں نے ورکروں کے ذہنوں سے نیشنلائزیشن کا لفظ ہی کھرچ کے نکال دیا تھا۔ان کا موقف یہ ہو چکا تھا کہ اب ہمیں معیشت کو ''ریگولیٹ'' کرنے کی ضرورت ہے۔کیونکہ نیشنلائزیشن قطعی طور پر ناکارہ اور بے سود ہوتی ہے۔ایسے ہی کئی دلائل دیے جاتے رہے۔لیکن پھر صرف دو یا تین ہفتوں کی حقیقی جدوجہد کے تجربے نے دہائیوں کے انٹی نیشنلائزیشن پروپیگنڈے کو یکسر اکھاڑ پھینک دیا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اور بائیں بازو کا فرنٹ (میلنشاں) جنہوں نے پہلے ہی الیکشن میں اچھی کارکردگی دکھائی ہے، اب مزید موثر پیش رفت کرے گا۔آگے چل کر فیکٹریوں میں تحریک کا آغاز ہوگا۔نوجوان بھی متحرک ہوں گے اور یوں سماج میں مزید ریڈیکلائزیشن ہوگی۔صورتحال کس قدر ریڈیکلائز ہو چکی ہے، اس کا اندازہ کمیونسٹ پارٹی آف فرانس کے اندر ہونے والے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ 2008ء میں پارٹی کے اندر ایسے رجحانات پیدا ہو چکے تھے جو کہ پارٹی کو ہی ختم کر دینے کیلئے سرگرم ہو چکے تھے، اب یہ عناصر ختم ہو چکے ہیں اور اور ان کی بجائے بائیں بازو اور میلنشاں کا ابھار ہو رہا ہے۔نیچے کمیونسٹ پارٹی کے عہدیدار اور ورکرز اس بات سے بہت خوش ہیں کہ وہ دوبارہ سے عوام سے جڑ رہے ہیں۔ان حالات میں ہمارے عالمی مارکسی رجحان نے کمیونسٹ پارٹی کی حالیہ کانگریس میں 10 فیصد ووٹ حاصل کیے ہے جو کہ ایک شاندار کامیابی ہے۔کمیونسٹ پارٹی میں مارکسی نظریات کی ترویج اور ترقی کے امکانات کے مواقع کھل رہے ہیں۔

فرانسیسی سرمایہ داری کے عمومی بحران کی حالت میں اور اس کے عام لوگوں پر پڑنے والے اثرات کی کیفیت میں افریقی ملک مالی کے ساتھ جنگی مہم جوئی کی جارہی ہے۔ جلد ہی فرانسیسی سامراج پر عیاں ہو جائے گا کہ جنگ میں قدم رکھنا تو آسان ہوتا ہے لیکن اس سے نمٹنا اور نکلنا کتنا مشکل۔ ابتدائی طور پر تو فرانس کو اپنی بھاری عسکری برتری کے باعث کامیابی مل جائے گی لیکن جب صورتحال ملک بھر میں پھیلے گی تو ایک مختلف منظرنامہ سامنے آئے گا کہ جب اسلامی ملیشیا گوریلا جنگ کے طریقے اپنائیں گے۔ بدقسمتی سے کمیونسٹ پارٹی آف فرانس اور لیفٹ فرنٹ کی قیادت دونوں ''انسانی بنیادوں'' پر اس جارحیت کی تائید کر رہی ہیں کہ یہ جنگ ''اسلامی بنیاد پرستی کو روکنے'' کیلئے کی جارہی ہے۔

برطانیہ

یورپ میں جو عمومی حالات چل رہے ہیں، برطانیہ بھی ان سے محفوظ نہیں۔ نومبر 2010ء میں یونیورسٹی فیسوں کے بڑھائے جانے کے خلاف بڑے پیمانے پر طلبہ تحریک سامنے آئی۔ اس کے بعد ٹریڈ یونین کے محاذ پر برطانیہ کی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ ستمبر 2011ء میں نوجوانوں کے ہنگامے پھٹ پڑے جو کہ برطانیہ کو لگ چکی سماجی بیماری کی نشاندہی کرتی ہے پولیس ان ہنگاموں پر قابو پانے میں مکمل بے بس نظر آئی۔ لندن شہر کے حصوں میں آگ لگی رہی۔ پھر جس انداز میں پولیس نے نوجوانوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی وہ بھی برطانوی سماج میں ایک نئی صورتحال کی غمازی کرتی ہے۔ راتوں کو عدالتیں لگا کر معمولی جرائم پر نوجوانوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اس کا موازنہ اس طور طریقے سے کیا جائے کہ جب بینکاروں کو اپنے ذاتی مفادات کیلئے کروڑوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ لیکن ان کے ساتھ معاملات خوش اسلوبی سے طے کئے گئے۔ برطانیہ کے محنت کش اور نوجوان اس امتیازی سلوک کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

آسٹریا

اکثر کہا جاتا ہے کہ قرضوں کے بحران کی ابتدا یونان سے ہوئی۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس کا آغاز مشرقی یورپ میں آسٹریا کے بینکوں کی جانب سے مشرقی یورپ میں کی جانے والی سرمایہ کاری اور اس کے بعد اس کیلئے کیے جانے والے بیل آؤٹ معاہدوں سے ہوا۔ آسٹریا، اس وقت یورپی ملکوں کی فہرست میں سرفہرست ہے جن سے کہا جا رہا ہے کہ اسے خود کو ''مقابلے بازی میں آگے بڑھنے کی تگ و دو'' کرنی چاہئے۔ یعنی حقیقی اجرتوں میں کٹوتیاں کی جائیں تاکہ بہتر کاروباری فضا کو سازگار کیا جا سکے وغیرہ وغیرہ۔ آسٹریائی بورژوازی پہلے سے چلے آنے والے مزدور قوانین اور اجتماعی سودا کاری پر حملوں میں مصروف ہے۔ جس کے نتیجے میں ٹریڈ یونینوں کے اندر لاوا ابل رہا ہے خاص طور پر دھات کی صنعت کے مزدوروں میں، یہاں تک کہ عام طور پر معتدل اور خاموش طبع سمجھے جانے والی ٹریڈ یونین قیادت نے بھی نیچے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ انہیں لڑائی کا ہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

مشرقی یورپ

مشرقی یورپ میں سٹالنسٹ حکومتوں کے انہدام کے بعد ابہام اور بے یقینی کا ایک دور شروع ہوا اور خاص طور پر سرمایہ داری بارے خوش گمانیاں پیدا ہو چلی تھیں۔ لیکن اب مشرقی یورپ ایک بار پھر، بحران کے بعد سے، تاریخی عمل کے مرکزی دھارے کا حصہ بن چکا ہے۔ ان ملکوں میں بحران سے نکلنے اور معاملات کو سنبھالنے کیلئے کوئی راستہ موجود نہیں۔ کئی ملکوں کے اندر نوجوانوں اور عوام کی تحریکیں شروع ہو چکی ہیں جو کہ اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہی ہیں۔ ہم نے اس عرصے کے دوران پبلک سیکٹر کی اجرتوں کی کٹوتیوں کے خلاف ہڑتالیں، طلبہ مظاہرے، دفتروں فیکٹریوں میں اجرتوں کے معاملے پر ہنگامے ہوتے دیکھے ہیں۔ ان ملکوں میں سلووینیا سب سے امیر اور ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے اور اسے سرمایہ دارانہ بحالی

کی سب سے روشن مثال قرار دیا جاتا رہا۔ یہ ایسے لگتا تھا کہ دوسرا آسٹریا ہے۔لیکن اب یہ اٹلی اور سپین جیسی حالت کو پہنچ چکا ہے۔ یہاں ہم کٹوتیوں کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر مظاہرے دیکھ چکے ہیں۔بیس لاکھ آبادی کے ملک میں ایک لاکھ افراد نے مظاہرہ کیا ہے اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ لوگ پرانے یوگوسلاویہ کے جھنڈے اور بینرز اٹھائے سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ بلکان خطے میں ہر طرف مارشل ٹیٹو کی شہرت دوبارہ بحال ہو رہی ہے لوگ اب دوبارہ ماضی کی طرف رجوع کر رہے ہیں جو کہ ان کے نزدیک بہت بہتر تھا۔ابھی کچھ دنوں پہلے سلووینیا کے صدر کو اپنے ملک کے قومی دن کی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے ،اس وقت اپنی تقریر مختصر کرتے ہوئے چھوڑنی پڑی جب نیچے سے سامعین نے اس پر مسلسل طنزیہ جملے کسنے شروع کر دیے۔صرف بیس سالوں کے عرصے میں ہی ،جس کی تاریخی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں ہوتی ،معاملات اس قدر بگڑ کر خراب ہو چکے ہیں۔گزشتہ پانچ سالوں کے دوران مجموعی قومی آمدنیوں میں مسلسل گراوٹ آ رہی ہے جبکہ بیروزگاری دوگنی ہو چکی ہے اور پبلک قرضہ بھی دوگنا ہو چکا ہے۔سارے بلکانی ممالک میں ریڈیکل نوجوانوں کی کانفرنسیں اور تقریبات ہو رہی ہیں۔رومانیہ میں بھی صورتحال کافی تلخ ہو چکی ہے اور اس کی معیشت منجمد ہے۔اس کے 20 شہروں کے اندر خودرو سرکشیاں ابھر کے سامنے آ چکی ہیں۔جو کہ اب تک سب سے بڑی تحریک ہے۔ہنگری بھی جہاں بہت سخت گیر اور رجعتی حکومتیں قائم چلی آ رہی تھیں، بڑی عوامی تحریکیں ابھرنا شروع ہو چکی ہیں۔بحران جوں جوں گہرا ہوتا جا رہا ہے ،یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے پاس کوئی بھی راستہ موجود نہیں۔یہ ادراک مشرقی یورپ کے محنت کشوں اور نوجوانوں کو مزید ریڈیکلائز کرے گا اور یوں یہ براعظم یورپ کی جدوجہد کا حصہ بن جائیں گے۔

نشیب وفراز

سارے یورپ میں اس وقت یورپی یونین کے خلاف موڈ فروغ پا رہا ہے۔ کیونکہ لوگ اسے کٹوتیوں کا ذریعہ اور ذمہ دار سمجھ رہے ہیں۔ دائیں بازو کی کئی پارٹیاں جن میں برطانیہ کی قوم پرست UKIP بھی شامل ہے، لوگوں کے غم وغصے اور جذبات کا استحصال کرنے میں مصروف عمل ہو چکی ہیں۔ اسی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہی ڈیوڈ کیمرون ریفرنڈم کی بات کر رہا ہے جو کہ موجودہ حالات میں برطانیہ کو باقی یورپ سے کاٹ کے رکھ دے گا۔

اصل نکتے کی بات یہ ہے کہ اب تک کوئی بھی حل نہیں نکل پایا ہے۔ کٹوتیوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی یوروزون کا بحران نہیں ٹل سکا ہے۔ صورتحال اتنی مایوس کن ہو چکی ہے کہ یورپی مرکزی بینک نے اعلان کیا ہے کہ وہ یورو کو بچانے کیلئے ہر ممکنہ طریقہ استعمال کرے گا۔ اس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ سپین اور اٹلی پر دباؤ کو کسی حد تک کیوں کم کر دیا گیا ہے۔ لیکن دباؤ کم کرنے کے باوجود بھی نیچے تہہ میں جو تضادات موجود ہیں وہ کم یا ختم نہیں ہوئے۔ یہ بحران دوبارہ اور بہت جلد سر اٹھائے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرا جھٹکا لگے گا۔ اور یہ سب جھٹکے بہت تکلیف دہ ہوں گے۔ اور جو ''سٹیٹس کو'' کو تہس نہس کر دیں گے۔ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ایک موضوعی عنصر یعنی محنت کشوں کی ایک انقلابی پارٹی کی غیر موجودگی میں بہت سی شکستوں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ ایک طویل اور دردناک عمل ہوگا۔ شدید طبقاتی جدوجہد کے میدان لگیں گے جن میں بھاری تعداد میں لوگ شامل ہوں گے۔ اس تحریک میں کئی اتار چڑھاؤ، کئی نشیب وفراز آئیں گے۔ ان مراحل میں ایسا بھی ہوگا کہ دایاں بازو اپنی جگہ بناتا بھی محسوس ہوگا۔ لیکن ان کے سبھی دلائل کھوکھلے اور عارضی ہوں گے اور عوام بار بار متحرک ہوں گے۔ نشیب وفراز کے انہی مراحل کے دوران ہی کئی بائیں بازو والے ردانقلاب اور فاشزم کے بارے ڈرتے ڈراتے اور واویلا کرتے نظر آئیں گے۔ اور یہ سب کچھ ظاہر کرتا ہے کہ یہ گروہی لیفٹسٹ معاملات کے ساتھ کتنی کم نظر ہم آہنگی کا شکار ہیں۔ اس وقت فوری طور پر فاشزم کے خطرے کا کوئی امکان نہیں۔ عمل کو اس کی کلیت میں دیکھنے کی بجائے وقتی اور جذباتی موڈ کے باعث کبھی اس طرف تو کبھی اُس

طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس دوران تحریک کو ناگزیر طور پر شکستیں بھی ہوں گی، ان میں بڑی شکستیں بھی ہوں گی۔ تاہم ہمیں نپولین کے اس عسکری سبق کو نہیں بھولنا چاہئے کہ ''شکست کھائی ہوئی فوج سب سے زیادہ سیکھتی ہے۔''

ہمیں سطح کے نیچے دیکھتے رہنا چاہئے اور سمندر کے اوپر موجود سکوت سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ پانی کی تہہ کے نیچے اس کے بہاؤ کا مطالعہ کرنا اور اس کو سمجھنا چاہئے۔

پچاس سالوں تک یورپی محنت کش طبقے کو طفل تسلیوں اور بے بنیاد احساس تحفظ کے فریب میں رکھا گیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس دوران محنت کش طبقے کو کچھ نہ کچھ حاصل بھی ہوا جس کی بدولت یہ قدرے نرم و نفیس بھی ہوتا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے ایک پورے تاریخی عرصے کے دوران لوگ ایک پرسکون اور آرام دہ زندگی گزارنے کے بعد اس کے عادی اور سہل پسند ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ بھی پہلے کی طرح عارضی اور وقتی بحران ہے اور یہ بھی کہ کٹوتیوں کے ایک دور کے بعد ہر چیز دوبارہ اپنی جگہ پر واپس لوٹ آئے گی۔

تاہم حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ بے عملی، جو ماضی میں تعمیر ہو چکی ہے اسے ہمارے پروپیگنڈے سے قابو میں نہیں لایا جا سکتا۔ ابھی ہم اس سب کیلئے بہت چھوٹے ہیں۔ اس وقت ہم مارکسسٹ یہ سمجھ رہے ہیں کہ عوام اپنے تلخ تر تجربوں سے بہت اہم اسباق سیکھیں گے اور واقعات کے بے رحم تھپیڑے ان پر بہت کچھ آشکار کر دیں گے۔ اور یہ سب کچھ ہی طبقے کو اس کی بے عملی کی کیفیت سے باہر نکالے گا۔ جیسا کہ کامریڈ ٹیڈ گرانٹ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''واقعات، واقعات اور صرف واقعات'' ہی ایک مخصوص مقام پر آ کر عوامی تنظیموں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیں گے جو کہ اس وقت کی صورتحال کی حقیقت کا ادراک کرنے سے صدیوں دور ہیں۔ ہمارے سامنے لیفٹسٹ رجحان ابھر کے سامنے آئیں گے جن میں پھر دائیں اور بائیں جانب دراڑیں پیدا ہوں گی۔ نیچے ورکرز حل مانگیں اور ڈھونڈیں گے جس سے سبھی تنظیمیں بحران کی زد میں آ جائیں گی۔

یہ وہ منظر نامہ ہے جس کیلئے ہم مارکس وادی تیاری کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی طاقتیں منظم کرنی ہیں اور مارکسی رجحان کو اس حد تک تعمیر کرنا ہے کہ یہ وہ داخلی عنصر بن جائے جس کا موجودہ اور مذکورہ

صورتحال تقاضا کر رہی ہے۔ مگر ہمیں اسی پر ہی تکیہ کر کے نہیں بیٹھ جانا چاہئے۔ ہمارے پاس وقت ہے لیکن یہ وقت کسی طور لامحدود نہیں۔ ہمیں لازمی طور پر مارکسی نظریات کو مزدور تحریک کے اندر ایک زندہ و تابندہ مادی قوت بنانا ہے ہمیں اپنے سیاسی تناظر سے رہنمائی لیتے ہوئے اور ضروری سبق سیکھتے ہوئے بروقت اور برمحل عمل کرنا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کے انقلاب کا تناظر

مصری انقلاب کے دو سالوں کے دوران انقلابی نوجوانوں، محنت کشوں اور اسلام پرست حکومت کے مابین ہونے والی جھڑپوں میں ہم نے قاہرہ کی سڑکوں پر کئی لوگوں کو مرتے دیکھا ہے۔ یہ اس صورتحال کی طرف اشارہ ہے جو آج پورے عرب خطے میں ہو رہا ہے۔ انقلابات نے مبارک اور بن علی کی حکومتوں کو تو گرا دیا لیکن ان سماجی مسائل میں کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہیں کیا جن کی وجہ سے انقلابات نے جنم لیا تھا۔

ہم نے ماضی میں کیا کہا تھا!

عرب انقلاب ہم مارکس وادیوں کے لیے کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ ہم وہاں ہونے والے واقعات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ہم نے عرب انقلاب پر 2007ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا، ''مشرقِ وسطیٰ میں طبقاتی جدوجہد کی تیاریاں'' اور اسی طرح کئی دوسرے مضامین بھی شائع کیے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب سرمایہ دارانہ نظام یورپ اور شمالی امریکہ میں عروج پر تھا اور جس میں لاطینی امریکہ پیش پیش تھا۔ عالمی سطح پر ہونے والی انقلابی صورتحال کے مدنظر ہم نے وینزویلا اور لاطینی امریکہ کے اہم انقلابی کردار کی اہمیت پر زور دیا تھا۔

جب ہم لاطینی امریکہ میں موجود انقلابی صلاحیتوں کی صورتحال کو دیکھ رہے تھے اور یہ پیش بینی کر رہے تھے کہ ایسی ہی صورتحال عالمی سطح پر بھی دیکھنے کو مل سکتی ہے تو اس وقت بھی بائیں بازو کے لوگ شک وشبے سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسے لوگ ہمیشہ عوام کی انقلابی صلاحیتوں کو

کم تر سمجھتے ہیں۔ایک وقت پر یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ لاطینی امریکہ اور مشرق وسطیٰ کی صورتحال ایک دوسرے کے متضاد ہے، وہ کہہ رہے تھے کہ مشرق وسطی میں سیاہ رجعتیت حاوی ہے۔اس وقت کچھ ''مارکسسٹ'' بھی یہ کہہ رہے تھے کہ عالمی مارکسی رجحان کی قیادت عالمی انقلاب کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی پرامید ہے۔

درحقیقت، ہم تناظر معروضی خواہشات کی بنیاد پر نہیں بناتے بلکہ معروضی صورتحال کے حقائق، معاشی، سماجی اور سیاسی صورتحال اور انہی کی بنیاد پر جنم لینے والے سماجی انقلاب کے حقیقی امکانات کی بنیاد پر تناظر ترتیب دیتے ہیں۔ہماری امید کی بنیاد کھوکھلی اور مجرد نہیں۔

2007ء میں ہم نے کہا تھا کہ لبنان میں جنگ ہارنے کی وجہ سے اسرائیل میں طبقاتی تضادات سامنے آئیں گے۔بندرگاہ اور دیگر اداروں کے مزدوروں کی ہڑتالوں نے ہمارے تناظر کو جلد ہی درست ثابت کیا۔ایران میں ہم نے حکومت کی اعلیٰ سطح پر جنم لینے والے تضادات اور بڑھتے ہوئی سماجی بے چینی کی طرف اشارہ کیا۔دوسال بعد ہم نے وہاں ایک شاندار انقلابی تحریک دیکھی جس نے حکومت کو اس بنیادوں تک ہلا کے رکھ دیا تھا اور صرف انقلابی قیادت کے فقدان کی وجہ سے حکومت کو نہیں گرا سکی۔

فلسطین پر ہم نے واضح لکھا تھا کہ کس طرح حماس اور الفتح فلسطینی سرحدوں کو سامراجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی وجہ سے عوام کی نظروں میں بے نقاب ہوتے جا رہے ہیں۔

مصر کی صورتحال کے متعلق اس وقت کے معاشی عروج کے باوجود ہم نے آنے والے طوفان کے حوالے سے کئی مضامین تحریر کیے تھے۔حالات کے حوالے سے جب کسی کا نقطہ نظر خلائی اور غیر جدلیاتی ہو تو وہ محض سطح کے اوپر ہی دیکھتا ہے جہاں سب بالکل ٹھیک ہے لیکن ہم سطح کے نیچے ہونے والی بڑی شدید ہلچل کو دیکھ رہے تھے۔ہم سمجھ رہے تھے کہ معاشی عروج محنت کش طبقے کو مضبوط کرے گا۔ہم نے خواتین کے کردار اور ان کے انقلاب کردار کی طرف بھی اشارہ کیا۔محلّہ ٹیکسٹائل کے مزدوروں کی ہڑتال جہاں برقع پوش محنت کش خواتین نے مرد محنت کشوں کو بھی ہڑتال کرنے پر مجبور کیا۔یہ سب اس صورتحال کی طرف اشارہ تھا جو آنے والے وقتوں میں جنم لینے والی

تھی۔ہم نے اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر بے روزگار نوجوانوں کے کردار کو بھی واضح کیا جو کہیں اپنا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ ایسا تیل تھا جسے فقط چنگاری کی ضرورت تھی۔

تیونس کی انقلابی چنگاری

تیونس میں یہ چنگاری 2010ء کے آخر میں میسر آئی جب ایک غریب نوجوان نے پولیس تشدد کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خود کو آگ لگا دی۔عوام کی وسیع پرتیں بھی ایسی ہی کیفیت میں زندہ تھیں اور حالات کا ادراک کرتے ہوئے وہ میدانِ عمل میں آئے اور تیونس کے انقلاب کا آغاز ہو گیا۔ تیونس کا انقلابی شعلہ اتنا بڑا تھا کہ اس نے مصر کو سلگاتے ہوئے پوری عرب دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مصر کے انقلاب کے حوالے سے کیے گئے ہمارے تجزیے کے مدمقابل کوئی دوسرا تجزیہ موجود نہیں تھا جب مبارک کے خلاف جدوجہد عروج پر تھی۔ہم نے صورتحال کے ہر موڑ کا تجزیہ کیا اور انقلابی عوام کے اگلے قدم کی پیش بینی کی۔ہم تب سے اب تک ہر مرحلے کو دیکھ رہے ہیں۔

عرب انقلاب کی خاصیت یہ ہے کہ وہاں محنت کشوں کی کوئی انقلابی قیادت موجود نہیں۔ اس کیفیت کو سمجھے بغیر ہم آنے والے واقعات کا درست اندازہ نہیں لگا سکتے۔واقعات ''معروضی عنصر'' یعنی انقلابی پارٹی کی تعمیر کا انتظار نہیں کیا کرتے۔ایسی کیفیت میں خلا پیدا ہوتا ہے جس نے لازماً پُر ہونا ہوتا ہے۔تیونس اور مصر میں یہ خلا اسلام پرستوں نے پُر کیا۔یہی لیبیا اور شام وغیرہ میں بھی ہوا۔

جب انقلاب سے ردانقلاب کی طرف اتنی تیز تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں تو بائیں بازو کے بہت سے لوگ دوبارہ اپنے پرانے نقطہ نظر کا پرچار کرنے لگ گئے کہ جیسے ''اسلامی بنیاد پرستی'' ایک اَن دیکھی اور تقریباً ناقابل تسخیر قوت ہے۔یہ بالکل ہی غلط بات ہے۔

اس قسم کی قوتوں کا ابھرنا انقلابی قیادت کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہوا ہے۔انقلاب محض ایک واقعہ کا نہیں بلکہ ایک عمل کا نام ہے۔انقلاب اور ردانقلاب ایک ساتھ چلتے ہیں،اس عمل میں

ایک یا دوسرے مقام پر کبھی انقلاب تو کبھی رد انقلاب حاوی ہو جایا کرتے ہیں۔نقطہ یہ ہے کہ زندگی سکھاتی ہے۔مصر اور تیونس میں خلا کو پُر کرتے ہوئے اسلام پرستوں نے حکومت تو بنالی لیکن حالات اب انہیں رد انقلابی قوت کے طور پر بے نقاب کر رہے ہیں۔ان کا مقصد انقلاب کو کاٹنا اور عوام کو رد انقلابی اسلامی بنیاد پرستی کی طرف جھکانا ہے۔سامراج مخالفت کا ڈھونگ رچا کر خفیہ طور پر ''عظیم شیطان'' کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے، سرمایہ داری نظام کو درکار پالیسیاں جاری رکھنا ہے یعنی کٹوتیاں کرنا، سبسڈیز میں کٹوتیاں اور دیگر اقدامات پر عمل درآمد کرنا ہے۔زبانی طور پر یہ نئے حکمران یہی دعوے کر رہے ہیں کہ وہ انقلاب کی خدمت ہی کر رہے ہیں جبکہ سچائی یہ ہے کہ وہ انقلاب کو کچلنے کے درپے ہیں۔سوال یہ ہے کہ خطے کے عوام اب یہ سارا کچھ ہوتا دیکھ رہے ہیں اور یہی ان ملکوں میں ہونے والے تازہ ترین واقعات کی وضاحت ہے۔

انقلاب کی نئی لہر کی اٹھان

انقلاب ابھی مکمل نہیں ہوا۔یہ ابھی تکمیل سے بہت دور ہے۔انقلاب کی ایک نئی لہر اب سر اٹھا رہی ہے۔ایسی کئی لہریں سامنے آئیں گی، جن کی وجوہات حسب ذیل ہوں گی؛ ایک تو داخلی عنصر یعنی انقلابی تنظیم کا نہ ہونا، دوم حکمران طبقات کی موجودہ کمزوری اور تیسری محنت کش طبقے کی بے پناہ طاقت۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمران طبقہ اتنا کمزور اور لاچار ہو چکا ہے کہ وہ تحریکوں کی اس اٹھان کو فوری طور پر دبایا کچل نہیں سکتا۔چنانچہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کیلئے اسے مستقل اور مسلسل سازشیں کرنی پڑ رہی ہیں اور یوں محنت کش طبقے کی قیادت کی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

2011ء میں ساری دنیا کی نگاہیں عرب انقلاب پر مرتکز ہو چکی تھیں۔لیکن پھر ایک مختصر وقت کے بعد ہی سب کی توجہ یورپ کی جانب چلی گئی۔یہ ایک اہم پیش رفت ہے جیسا کہ ہم کئی بار وضاحت کر چکے ہیں کہ ایک عالمی انقلاب کی کلید جدید ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ماضی میں 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں نوآبادیاتی انقلابات ہوئے جبکہ اسی

دوران ترقی یافتہ ممالک کے اندر ایک طویل دورانیے کا عروج موجزن تھا۔تب نوآبادیاتی ملکوں کے اندر صورتحال انقلابات کیلئے سازگار تھی ۔جبکہ ترقی یافتہ ملکوں میں انقلاب تاخیرزدگی کا شکار ہو چکا تھا۔اسی سے ان ملکوں میں ہونے والی مخصوص ترقی کی وضاحت ہوتی ہے۔نوآبادیاتی ممالک کے عوام ترقی یافتہ ممالک میں انقلاب کے ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے،اسی لئے وہ انقلاب کی طرف پیش قدمی کرتے چلے گئے ۔لیکن اس وقت کی اپنی صورتحال میں اور خاص طور پر سٹالنسٹ قیادت کی ان انقلابات کی قیادت کرنے کے باعث ان انقلابات سے جو ممکنہ بہتر حاصل ہو سکتا تھا وہ سٹالنزم تھا۔اس سے پرولتاری بونا پارٹ ازم کے اس مظہر کی وضاحت ہو جاتی ہے جو گوریلا جنگوں،عسکری بغاوتوں اور دوسری شکلوں میں سامنے آیا۔

اب اس وقت صورتحال بہت مختلف ہے۔ہمارے سامنے دنیا بھر میں انقلابی یا قبل از انقلاب کی دھماکہ خیز صورتحال موجود ہے۔اس صورتحال میں نوآبادیاتی ممالک ہی نہیں بلکہ جدید ترقی یافتہ ممالک بھی شریک ہیں۔اس وقت عرب کے عوام اپنے انقلاب کو ایک علاقائی تحریک کے ساتھ ساتھ ایک عالمگیر تحریک کا بھی حصہ سمجھے ہوئے ہیں۔وہ سپین،یونان وغیرہ پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں اور وہاں کے واقعات سے جذبے اور حوصلے کشید کر رہے ہیں۔اور بالکل اسی انداز میں ہی یورپ کے عوام بھی مشرق وسطیٰ میں ہونے والے انقلابی واقعات سے متاثر ہو رہے اور ان سے شکتی حاصل کر رہے ہیں۔مثال کے طور پر ہم وسکانسن امریکہ میں سکاٹ واکر کے خلاف جدوجہد میں دیکھ سکتے ہیں جو کہ اسی وقت ہوئی کہ جب مصر میں حسنی مبارک کا خاتمہ ہوا۔اس کیفیت میں ایک اہم عنصر یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کی انقلابی لہر کو کچلنے کے ضمن میں امریکی اور اسرائیلی سامراجی طاقت کی کمزوری ہے اور یہ بات انقلابی سرکشی میں شریک لوگوں کیلئے بہت زیادہ اعتماد اور حوصلے کا باعث بنی ہوئی ہے۔

مصر

پہلے پہل لوگوں کی ایک خاصی تعداد کو مصر میں اخوان المسلمون کے بارے میں بہت سی خوش فہمیاں وابستہ ہوئیں۔لیکن پھر بہت جلد ہی لوگوں پر ان کی اصلیت عیاں ہونی شروع ہو گئی۔اب صدر مرسی کوشش کر رہا ہے کہ ایک قسم کے بونا پارٹ ازم کو اختیار کیا جائے۔اس کیلئے وہ زیادہ سے زیادہ اختیارات خود میں مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔لیکن اس کا جواب اسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی جانب سے شدید مزاحمت کی صورت میں ملا ہے۔لوگ جوش وجذبے کے ساتھ سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے اخوان المسلمون کے ہیڈ کوارٹرز پر حملے کرتے ہوئے حکومت کے خاتمے کا مطالبہ کر دیا۔لوگوں کے اس جواب کا جواب ایک انتہائی سفاکانہ وحشت سے دیا گیا۔

اس قسم کے تجربات سے عوام دیکھ اور سیکھ رہے ہیں کہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا ہے۔اب اخوان کی تائید وحمایت انتہائی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے انقلاب کیلئے جدوجہد کی تھی، جو کہ صرف حسنی مبارک کو اکھاڑنے کیلئے نہیں تھی بلکہ لوگوں کو درپیش روزمرہ کے سلگتے سماجی اور معاشی مسائل سے نجات بھی ان کی جدوجہد کا بنیادی مرکز ومحور تھا۔اور اب جبکہ مبارک کا خاتمہ تو ہو چکا ہے لیکن زندگی کے بنیادی مسائل نہ صرف موجود بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ بدتر ہو چکے ہیں۔مصر کی مجموعی قومی آمدنی جو انقلاب سے پہلے 6 فیصد تھی اس وقت 1.8 فیصد تک گر چکی ہے۔معیشت میں تیزی سے گراوٹ آئی ہے۔بیروزگاری میں شدید اضافہ ہو چکا ہے جبکہ غیر ملکی سرمایہ کاری پہلے سے کہیں کم ہو کر اب صرف 10 فیصد رہ گئی ہے۔ان کیفیات میں نوجوان اور محنت کش اہم نتائج اخذ کر رہے ہیں۔اسلام پسندوں کی حقیقت سب پر عیاں ہو چکی ہے اور سیاست ایک اہم موڑ لے چکی ہے۔نیشنل سالویشن فرنٹ NSF کا ابھار کہ جس میں مختلف قوتیں شامل ہیں، اس موڑ کا اظہار ہے۔جو کہ خود کو سوشلسٹ قرار دیتے ہیں (جبکہ وہ درحقیقت سوشل ڈیموکریٹس ہی ہیں)۔یہ ایک اہم دلچسپ پیش رفت ہے۔کیونکہ جمال عبدالناصر بھی پرولتاری بونا پارٹ ازم کی سمت جا رہا تھا اور اس نے بہت سے ادارے نیشنلائز کرتے ہوئے بہت

سی اصلاحات کی تھیں اور یوں سامراج کے مخالف کھڑا ہو گیا تھا۔ ناصر کو آج بھی مصر کا محنت کش طبقہ اپنی یادداشت کا مثبت حصہ بنائے ہوئے ہے۔

تاہم فرنٹ کی قیادت میں البرادی جیسے لبرلز اور امر موسیٰ جیسی حسنی مبارک کی باقیات بھی شامل ہیں۔ یہ پاپولر فرنٹ قسم کی کوئی چیز ہے جس میں مختلف قسم کی قوتیں شریک ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں کہ جن کی جڑیں مصر کے محنت کش طبقے میں ہیں اور وہ بھی کہ جو حسنی مبارک کے عہد کی باقیات ہیں۔ فرنٹ کو مصری عوام میں بڑی مقبولیت میسر آ رہی ہے۔ اور یہ اشارہ بھی ہے کہ آگے چل کر صورتحال میں مزید ریڈیکلائزیشن ہو گی۔ آنے والے وقت میں ہم دیکھیں گے کہ یہ حکومت مزید شدید دباؤ میں آئے گی۔ بورژوازی اور سامراج کے نقطہ نظر سے لازمی ہے کہ مزید کٹوتیاں کی جائیں۔ اس مرحلے پر صدر مرسی آئی ایم ایف اور عالمی بینک کی پالیسیاں لاگو کر رہا ہے۔ وقتی طور پر اس نے مظاہروں کے خوف سے چپ سادھی ہوئی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسے بورژوازی اور سامراج کی طرف سے تفویض کیے گئے اہداف پر ہی معاملات چلانے ہیں چنانچہ اخوان المسلمون کو عوام پر اپنے حملے تیز کرنے ہوں گے اور اس کے نتیجے میں نیچے سے عوام کی مزاحمت میں بھی شدت آئے گی۔

اسلامی بنیاد پرستی؛ ایک رجعتی مظہر

اخوان المسلمون شروع دن سے ہی ایک رجعتی طاقت تھی اور ہے۔ ہم نے اس وقت بھی اپنا اصولی موقف سامنے رکھا تھا جب یہ اپنے آپ کو انقلاب کا حصہ قرار دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم نے صاف لکھا اور کہا تھا کہ یہ دراصل کون ہیں کیا ہیں اور یہ بھی کہ یہ کیا کریں گے! بدقسمتی سے ہمارے بائیں بازو کے دوست جن میں ریولوشنری سوشلسٹس، برطانیہ کی SWP سے وابستہ مصری گروپ نے اخوان المسلمون کا اس جواز کی وجہ سے ساتھ دیا کہ یہ انقلاب کا حصہ ہیں، کیا ہوا اگر یہ دائیں بازو کے ہیں! اپنے آپ کو سوشلسٹ کہنے یا کہلوانے والے کسی بھی فرد یا تنظیم کیلئے اس سے بڑھ کر دلسوز مؤقف اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ سوشلسٹ بھول گئے کہ مارکس وادیوں کا یہ رول نہیں ہوا کرتا کہ وہ عوام کی صفوں کے بالکل آخر میں جا کر موجود رہیں۔ان کا تو یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ محنت کشوں اور نوجوانوں کو سچائی بتائیں اور بتاتے رہیں اگر چہ بعض اوقات سچ بتانے سے وقتی طور پر ''غیر مقبول'' ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔کبھی کبھار تو اس قسم کی کیفیت میں برداشت کا امتحان بھی سخت مشکل ہو جایا کرتا ہے اور اگر کوئی مارکسزم کے بنیادی نظریات سے بخوبی واقف اور وابستہ نہیں ہوگا تو لامحالہ اس سے کئی سنجیدہ غلطیاں سرزد ہوں گی۔عالمی مارکسی رجحان نے صرف سچ ہی کو سامنے رکھا اور پیش کیا کہ اخوان المسلمون کی اصلیت کیا ہے۔چنانچہ اس کی بدولت اب ہمارے پاس اتھارٹی موجود ہے کہ ہم مصر کی تحریک کے سنجیدہ اور معتبر بائیں بازو کے لوگوں سے ڈائیلاگ کر سکیں۔جبکہ وہ سبھی جن کو ابہام نے اپنی گرفت میں لئے رکھا،اب کف افسوس مل رہے ہیں۔یہ ایک واضح مثال ہے کہ کیسے ایک نظریاتی بحث کی جاتی ہے! کیسے ایک مظہر کو سمجھا جاتا ہے اور کیسے ہم اپنا مؤقف رکھتے ہیں۔اسی سے ہی یہ طے ہوتا ہے کہ آپ کچھ تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں!

ایک غلط مؤقف کی مدد سے آپ کچھ بھی تعمیر نہیں کر سکتے خواہ آپ وقت طور پر کتنی بھی حمایت حاصل کر لیں۔جلد یا بدیر سچائی سامنے آ ہی جاتی ہے۔

مصر جیسی کیفیت ہم تیونس میں بھی دیکھ سکتے ہیں جہاں اب بڑے احتجاج اور مظاہرے شروع ہو چکے ہیں اور یہاں گزشتہ سال کے آخر تک وہاں مقامی اور ملکی سطح کی کئی ہڑتالیں ہوئی ہیں۔ جبکہ وسط دسمبر میں ایک عام ہڑتال کی کال بھی دی گئی لیکن جسے آخری لمحے پر UGTT یونین کی قیادت نے موخر کر دیا۔ہڑتال کو ملتوی کرنے کا فیصلہ یونین کی مرکزی باڈی میں انتہائی اقلیتی منظوری سے کیا گیا۔یہ درست ہے کہ یونین کے اندر ایک مضبوط لیفٹسٹ عنصر موجود ہے۔اگر اس ہڑتال کو ملتوی نہ کیا جاتا تو تیونس کی اسلامی حکومت کا دھڑن تختہ یقینی تھا۔اس کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بڑی عوامی تحریکیں ابھری ہیں،خاص طور پر اپوزیشن لیڈر شکری بیلاد کے قتل کے بعد ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے برسر اقتدار النہد اپارٹی کے دفاتر پر حملے کیے کیونکہ ان کے مطابق النہد اہی اس قتل کی ذمہ دار تھی۔تیونس اور مصر دونوں ملکوں

میں اقتدار پر براجمان اسلامی پارٹیاں اپنے اصلی رنگ وروپ کے ساتھ سامنے آرہی ہیں۔جس کے نتیجے میں عوام پہلے سے زیادہ بائیں بازو کی جانب ریڈیکل ہوتے جارہے ہیں۔کیا کوئی یہ شک کرسکتا ہے کہ ان حالات میں اگر یہاں کوئی سوشلسٹ قوت موجود ہوتی تو وہ کس قدر تیزی سے پھل پھول چکی ہوتی!!لیکن شومئی قسمت کہ اب اسلامی بنیاد پرستی اپنی تمام تر سیاہ کاریوں کے ساتھ منظرنامے میں موجود ہے۔ ہمارے سامنے وہ عوام ہیں کہ جو اپنے تجربے سے بہت اہم اسباق سیکھ رہے ہیں اور ایک اعلیٰ معیار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔تیونس اور مصر دونوں ملکوں میں اس وقت یہی کیفیت ہے۔

لیبیا

تیونس اور مصر کے انقلابات نے بہت ہی دوررس اثرات مرتب کیے اور یہ ان ملکوں کی سرحدوں سے بھی باہر نکلتے چلے گئے۔ہم نے دیکھا کہ لیبیا میں بھی عوام نے اپنے ان پڑوسی ملکوں کا راستہ اپنا لیا لیکن لیبیا اپنے ان دونوں ہمسایوں سے بہت مختلف ہے۔اس کی ایک بہت ہی مختلف تاریخ ہے جہاں کا محنت کش طبقہ بہت ہی کمزور حالت میں ہے۔چنانچہ یہاں انقلاب کا عمل انتہائی تذبذب اور انتشار کا شکار ہوا اور یہ تیونس اور مصر کی طرح کے نتائج نہیں پیدا کرسکا۔سامراجی بمباری کے زیرسایہ حاصل کردہ نام نہاد آزادی نے ملک کو ایک انتشار میں مبتلا کرڈالا۔مختلف نوعیت کی ملیشیائیں اور قبائلی جنگجو اس کیفیت میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ عالمی سطح پر بورژوازی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کس طرح سے یہاں کے حالات سے نپٹا جائے!جو آپے سے باہر نکل چکی ہیں۔ایک من پسند مغرب نواز حکومت کی بجائے ان کے ہاتھ جو کچھ لگا ہے وہ محض بدحالی کے سوا کچھ نہیں۔طرابلس اور بن غازی میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔جبکہ باقی علاقوں کو مختلف قبائلی جنگجوؤں نے اپنے کنٹرول میں لیا ہوا ہے۔

جب قذافی پر مغرب کا حملہ ہوا تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔وہ بار بار کہتا اور یاد دلاتا رہا کہ ''میں تمہارا دوست ہوں''۔اس کو بہت صدمہ پہنچا کیونکہ وہ آخر تک اپنے مغربی دوست

حکمرانوں کے ساتھ درست طور پر معاملات چلاتا رہا تھا۔''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے دوران وہ مغرب کا ساتھ دیتا رہا۔وہ شمالی افریقہ کے ساحلوں کی نگرانی کرتا رہا تا کہ وہاں سے یورپ جانے کے راستوں کی ناکہ بندی کر کے غیر قانونی طور پر یورپ جانے والوں کو روک سکے۔ لیکن مغربی حکمرانوں، خاص طور پر فرانس نے لیبیا میں مداخلت کو عرب انقلاب کے عمل میں شریک ہونے کا موقعہ سمجھا تا کہ اس سارے عمل کو کاٹ کے رکھ دیا جائے اور اسے ایک رجعتی عمل میں بدل دیا جائے۔

لیکن اب یہاں مغرب کو ایک انتہائی ناخوشگوار اور غیر متوازن صورتحال نے گھیرا ہوا ہے۔ یہ گڑبڑ اب قریبی ملک مالی تک پہنچ چکی ہے اور خطرہ ہے کہ یہ اس سے بھی آگے جا سکتی ہے۔یہ درست ہے کہ القاعدہ کو یہاں ایک موقع اور جگہ میسر ہے اور وہ مداخلت بھی کر رہی ہے۔لیکن اس کے باوجود اپنی ساری توجہ القاعدہ پر مرتکز کرنا بھی نامناسب ہوگا۔بلاشبہ وہ موجود ہے لیکن صرف القاعدہ ہی سب کچھ نہیں ۔قذافی نے قبائلی عمائدین کے مابین معاونت کا ایک پیچیدہ تانا بانا بنا ہوا تھا۔اس نے انہیں خریدا ہوا تھا اور وہ انہیں چالاکی سے آپس میں لڑائے اور الجھائے ہوئے تھا۔لیکن اب اس مرکز و محور کے خاتمے کے بعد یہ اندھی قوتیں اب بے مہار ہو چکی ہیں اور لیبیا ٹکڑوں میں تقسیم ہو کے رہ گیا ہے۔اور اس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ بھی منڈلا رہا ہے۔

لیکن پھر اسی لیبیا میں ہی مصر اور تیونس کی طرح ایک مضبوط بنیاد پرست مخالف رجحان بھی موجود ہے۔مثال کے طور پر بن غازی میں امریکی سفیر کے قتل کے بعد ہزاروں لیبیائی باشندوں نے سلفیوں کے ہیڈ کوارٹرز پر حملہ کر کے اسے بھسم کر دیا جبکہ کئی سلفی بھی ہلاک کر دیے گئے۔اس دوران مظاہرین مطالبے کرتے رہے کہ ان بنیاد پرستوں کو غیر مسلح اور حدود میں رکھا جائے۔

مالی کا تنازعہ

سامراجیوں کی بمباری سے یہ نتیجہ نکلا کہ لیبیا غیر مستحکم ہو گیا اور وہاں اسلامی بنیاد پرستوں کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے کو وہاں سرگرم کر سکیں اور یوں یہ مالی جو کہ ایک نوآبادیاتی دور کی ایک باقیات

میں سے ہے، کے اندرونی تنازعے کے ساتھ جڑ چکے ہیں ۔مالی کی سرحدیں مصنوعی ہیں اور جنہوں نے مختلف زندہ قومیتوں کوایک دوسرے سے کاٹ کے رکھا ہوا ہے، جبکہ مختلف زبانوں اور مذہبوں کے لوگ آپس میں الجھے ہوئے ہیں ۔اس کیفیت نے یہاں ایک گنجھلک قومی مسئلہ پیدا کیا ہوا ہے ۔ اسلامی بنیاد پرست اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔صورتحال قابو سے باہر ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے سامراجی ایک کے بعد دوسری فاش غلطی کرتے چلے جارہے ہیں۔

لیبیا میں فوجی مداخلت کیلئے فرانسیسی آپے سے باہر نکلے جارہے تھے۔انہوں نے یہ اندازہ ہی نہ لگایا کہ اس کے مالی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے، چنانچہ انہیں اب مالی میں بھی فوجی مداخلت پر مجبور ہونا پڑ گیا ہے۔ مالی ایک ایسا ملک ہے کہ جس میں گزشتہ ایک سال سے شدید خانہ جنگی ہورہی ہے۔ یہاں کے توارگ قبائل قومی جدوجہد آزادی کی اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں ۔جبکہ دہائیوں سے MNLA بھی باماکو کے اقتدار مطلق کے خلاف برسر پیکار چلی آرہی ہے ۔ 2011ء کے آخر میں بنیاد پرستوں کے کئی گروپوں نے ایک اتحاد تشکیل دیا ان میں القاعدہ المغرب AQIM، انصارالدین اور جنوبی افریقہ کی تحریک الجہاد والوحدت MOJWA شامل ہیں۔اپریل میں اس اتحاد نے مالی کے شمالی حصے پر قبضہ جمالیا جن میں کڈال، گاؤ اور نیافونکے نامی بڑے شہر بھی شامل ہیں۔توارگ ملیشیا اور مرکزی حکومت کے مابین ہونے والے عارضی معاہدے نے بڑی حد تک صورتحال کو سنبھالا دیا لیکن ابھی اس معاہدے کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ القاعدہ کے جہادی میدان میں آ ٹپکے ۔ مالی کی افواج سے کہیں زیادہ منظم اور جذبے سے سرشار چار ہزار جہادی لڑاکوں کی موجودگی نے فرانسیسی سامراج کے مفادات کیلئے صورتحال کو بہت زیادہ تشویشناک اور غیر یقینی بناڈالا ہے۔

مغربی افریقی ممالک میں مالی ایک اہم ملک ہے جو کہ نائجر کی جانب ایک اہم گزرگاہ ہے اور فرانس کے جوہری پاور پلانٹس کیلئے یورینیم کی فراہمی کا سب سے اہم سپلائر ہے۔سامراج کی جانب سے ''اسلامی بنیاد پرستی کے ابھار کے شور شرابے کے نیچے اصل میں اس کے اہم سٹریٹجک

اور معاشی مفادات داؤ پر لگے ہیں۔

فرانس کا دعویٰ ہے کہ اس کی مالی میں فوجی مداخلت 'جمہوریت کے دفاع' کیلئے ہے ۔جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مالی میں جمہوریت ہے ہی نہیں ۔یہاں تک کہ معمولی نوعیت کی بورژوا جمہوریت کا بھی وہاں کوئی وجود نہیں۔مارچ 2012ء میں یہاں ایک فوجی بغاوت ہوئی جس نے پچھلی حکومت کو ختم کرتے ہوئے کیپٹن امادو اسانوگو کی قیادت میں فوجی آمریت مسلط کر دی۔جس نے آئین سمیت سبھی بنیادی جمہوری حقوق معطل کر ڈالے۔اس نے خود ہی صدر نامزد اور برطرف کرنے کا اختیار سنبھال لیا ہوا ہے۔سانوگو کی تربیت امریکہ میں ہوئی ہے چنانچہ اسے امریکہ کی جانب سے اعتماد کی سند بھی بخش دی گئی۔لیکن وہ بھی کچھ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا یعنی وہ باغیوں کو پیش قدمی کرنے سے نہیں روک سکا۔اس سے ''ناخوش '' جمہوری فرانس کو صورتحال میں مداخلت کرنی پڑ گئی۔حقیقت یہ ہے کہ یہاں صورتحال کا کوئی آسان حل نہیں ہے۔نہ تو مالی نہ ہی لیبیا میں۔صحیح اور حقیقی حل تبھی ممکن ہو سکے گا جب مصر اور تیونس میں محنت کش طبقہ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے گا۔تبھی جا کر لیبیا میں صورتحال زیادہ تیزی سے واضح ہو سکے گی۔

کوئی بھی اس ملک یا اُس ملک کی محدود سرحدی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے تناظر تشکیل نہیں دے سکتا۔خاص طور پر مالی جیسے پسماندہ ملکوں کے معاملات میں تو تناظر کسی طور ممکن نہیں رہتا۔جدید ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے واقعات آخر کار ان جیسے کم ترقی یافتہ ممالک میں ہونے والے واقعات کا تعین کریں گے۔اس حوالے سے یورپی انقلاب ہی وہ کنجی ہے جس سے یہ کھل سکے گا کہ ایسی صورتحال میں معاملات کیا رنگ روپ اختیار کریں گے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔عرب انقلاب نے یورپی عوام کو متاثر کیا اور اب یورپی انقلاب عرب عوام کیلئے امید اور سرشاری کا باعث بن رہا ہے۔

شام

اس ساری مذکورہ کیفیت میں ہمیں شام کے انقلاب کی مخصوص کیفیتوں کو جانچنا اور پرکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا ہوگا کہ انقلاب کی بنیاد ہے کیا؟ اس عمل کی عمل انگیزی تو مصر اور تیونس سے ہوئی اور نوجوان خاص طور پر وہاں کے واقعات سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے بہت بڑی سرگرمیاں بھی کر کے دکھائیں۔ لیکن اس دوران ہی وہاں ایک پر اعتماد قسم کی بے نیازی بھی موجود تھی۔ مصر اور تیونس کے تجربات سے یہ اس خیال میں رہے کہ مظاہروں اور چوکوں پر دھرنوں سے ہی بشار الاسد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اپنی تحریک میں تو یہ لوگ بہت جراتمند اور سرشار تھے لیکن یہ حکومت کو گرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ بجائے حکومت کا خاتمہ ہوتا یہ اور بھی وحشی اور خونخوار ہوتی چلی گئی وہ بھی اس حد تک کہ مزاحمت کرنے والوں کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔

شام کی موجودہ کیفیت کو جانچنے کیلئے ہمیں اس تبدیلی کو دیکھنا سمجھنا ہوگا جو پچھلے عرصے کے دوران شامی معیشت میں وقوع پذیر ہوئی۔ اس دوران قومی اثاثوں کو نجکاری کی بھینٹ چڑھا دیا گیا جن کے باعث شام کی معیشت کی فطرت ہی یکسر تبدیل ہو کے رہ گئی۔ صنعت اور دوسرے معاشی اثاثے 1960ء کی بغاوت کے بعد سے قومی تحویل میں لے لئے گئے تھے۔ اس کے بعد تعلیم اور صحت کے شعبے میں کی جانے والی اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس مذکورہ بغاوت کے بعد جو حکومت برسر اقتدار آئی وہ ایک پرولتاری بونا پارٹسٹ حکومت تھی۔ یہ ایک ایسی طرز حکمرانی تھی کہ جس میں معیشت کا بھاری حصہ ریاستی ملکیت اور مرتکز منصوبہ بندی کا حامل تھا لیکن اس سب میں کہیں بھی مزدور جمہوریت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بنیادی طور پر یہ حکومت روس کے سٹالنسٹ ماڈل پر قائم ودائم رہی۔ سوویت روس کے انہدام کے بعد سے شامی حکومت نے چین کی طرز معیشت کی طرف دیکھنا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ قومیائے گئے صنعتی ادارے نجکاری میں دے دیے گئے لیکن ان کے مالکان بھی کہیں باہر سے نہیں بلکہ خود حکومت کے اندر سے ہی سامنے آئے۔ یہ سلسلہ 1991ء سے شروع ہوا لیکن گزشتہ دہائی میں عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اگر ہم 2001ء سے 2005ء کے 9ویں پانچ سالہ منصوبے کا 2006ء سے 2010ء کے

منصوبے کے ساتھ موازنہ کریں تو حسب ذیل صورتحال سامنے آتی ہے۔اس عشرے میں پہلی نصف مدت کے دوران پبلک سیکٹر حاوی رہا لیکن اس دوران ریاست کے زیر انتظام اداروں کے کام کے طریقوں میں تبدیلی واقع ہوئی۔ان کو ایسے ریاستی سرمایہ دارانہ اداروں میں ڈھال دیا گیا جو کہ منڈی کی معیشت کی طرز اور تقاضوں کے مطابق کام کرتے ہیں نہ کہ منصوبہ معیشت کے تقاضوں کے۔عشرے کے دوسرے حصے میں نجی شعبے نے اپنی سبقت ظاہر اور قائم کرنی شروع کردی۔2007ء تک معیشت کا 70 فیصد نجی ہاتھوں میں جا چکا تھا۔اس سارے کھیل نے شام کی عمومی زندگی پر شدید اثرات مرتب کئے جس کی وجہ سے سماجی پولرائزیشن میں شدت آنی شروع ہو گئی۔علوی حکمران ٹولے سے وابستہ افراد پر مبنی ایک نئی اشرافیہ ابھر کر سامنے آئی جبکہ دوسری طرف غربت کی شرح میں اضافے نے سماج میں ایک الگ کیفیت کو ابھار دیا۔2005ء میں 30 فیصد لوگ (53 لاکھ) غربت کی شرح کے نیچے بسر کر رہے تھے اور ان میں سے بھی 20 لاکھ افراد کو خوراک کی فراہمی بھی میسر نہیں تھی۔2000ء کی دہائی شروع ہوتے ہی افراط زر نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔2003ء میں یہ 1.3 فیصد سے بڑھ کر 2007ء میں 18 فیصد تک پہنچ گیا تھا۔بنیادی غذائی اشیا کی قیمتوں میں 60 فیصد سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ناخواندگی جو کہ ماضی میں قصہ پارینہ بن چکی تھی پھر سے منظر عام پر آنی اور پھلنی پھولنی شروع ہوگئی۔لیفٹسٹوں کے کئی دوست اس بات کو تہہ تک سمجھنے سے قاصر ہیں کہ شام میں دراصل کیا ہو رہا ہے۔وہ معاملات کو صرف سیاہ وسفید میں دیکھنے کے عادی ہیں کہ یا تو انقلاب ہو رہا ہے یا پھر ردانقلاب، یا تو سامراجیت یا پھر سامراج مخالفت۔کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ''عرب بہار کے بعد اسلامی سرما شروع ہو چکا ہے''۔انہیں عوام رجعتی ردانقلابی پسماندہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ نظر آتے ہیں۔وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کس طرح سے ایک انقلابی عمل راستہ بھٹک سکتا ہے یا بھٹک جاتا ہے اور ایک مختلف سمت بھی چلا جاتا ہے۔ہمیں سمجھنا چاہئے اور ہمیں لازمی سمجھنا ہوگا کہ جدلیاتی مادیت کیا ہوتی ہے اور کیسے کارفرما ہوتی ہے تب جا کر ہمیں اس جاری عمل کی حرکیات کی سمجھ بوجھ سہل ہو سکے گی۔یہ کسی طور ایک سیدھا عمل نہیں اور صورتحال اپنی ضد یا مخالف میں بھی بدل جاتی ہے۔

ایک بار پھر، ایک داخلی عنصر کی غیر موجودگی اس سارے خرابے کو سمجھنے کا مرکزی نکتہ ہے۔ شام میں موجود حکومت کی بربریت کی کیفیت میں یہاں کوئی موثر انقلابی پارٹی بنانا مصر سے کہیں زیادہ کٹھن عمل تھا۔ان حالات میں شام کے اندر انقلاب ابھر کر سامنے آیا جس کی ہم مارکس وادیوں نے حمایت کی۔جو بات یہاں سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ بلاشبہ انقلاب ابھرتے ہیں اور عوام ان میں متحرک بھی ہوتے ہیں لیکن اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ یہ کامیاب بھی ہوں گے۔اگر یہ سب کیفیات مل بھی جائیں لیکن ایک انقلابی پارٹی کا وجود نہ ہو تو ایک انقلاب رد انقلاب میں بھی بدل جاتا ہے۔ہمارے پاس 1930ء کے سپین کے انقلاب کی واضح مثال موجود ہے۔ رد انقلاب نے دو شکلوں میں انقلاب کو اپنی جکڑ میں لیا تھا ایک تو فرانکو کی کھلی فاشسٹ بغاوت اور دوسرا ریپبلکن کیمپ کا ''ڈیموکریٹک اور سٹالنسٹ'' طرز کا حامل ہو جانا۔اس کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سپین میں 1930ء کی دہائی میں انقلاب ہوا۔لیکن پھر انقلاب کسی طور ایک سیدھے رستے نہیں چلتے۔ہم کسی طور یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ہمیں ویسا ہی ہوتا نظر آئے جو ہونا چاہیے۔ سیدھا، سیاہ و سفید جیسا، اور وہ بھی ایک داخلی عنصر کی غیر موجودگی میں یعنی ایک عوامی انقلابی پارٹی کے نہ ہوتے ہوئے۔

شام میں اس وقت صورتحال انتہائی پیچیدہ ہو چکی ہے۔شام میں بے شمار انقلابی نوجوان موجود ہیں جو کہ بشارالاسد سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔لیکن وہ اس کی اپوزیشن کے کلی کردار کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہیں۔ہمیں بہرحال وہی کہنا چاہئے کہ جو ہو رہا ہے اور دیانتداری سے واضح کرنا چاہئے جو ہو چکا ہے۔تحریک کی ابتدا میں جو ایک بے نیازانہ اعتماد تھا وہ اب صورتحال کی بے رحمی کے ہاتھوں ہوا ہو چکا ہے۔اب صورتحال ایک وحشی خانہ جنگی میں تبدیل ہو چکی ہے۔اس قسم کی کیفیت میں اسلامی بنیاد پرست گروہ بھی دراندازی کر چکے ہیں جنہیں سعودی عرب، قطر اور دوسری رجعتی حکومتوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔یہی عناصر ہی ہیں جو کہ علویوں اور عیسائیوں وغیرہ کے قتل عام کے ذمہ دار ہیں۔یہ لوگ کسی طور بھی انقلابی قوت نہیں ہیں۔ان کا ہدف اور مقصد نسلی و مسلکی تضادات کو جنم اور فروغ دینا ہے۔ان کی وجہ سے کئی لوگ دوبارہ سے بشار کے حامی

بن چکے ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ بشار کا اقتدار ختم ہو لیکن ہم کسی طور بھی کبھی بھی ان رد انقلابی قوتوں کی رتی برابر حمایت نہیں کر سکتے۔ ہم سامراجی جارحیت اور مداخلت کے خلاف ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم رجعتی اور رد انقلابی اپوزیشن کے بھی خلاف ہیں کہ جن کا نہ تو محنت کش طبقے سے کوئی تعلق واسطہ ہے، نہ نوجوانوں سے اور نہ ہی یہاں کے غریبوں سے۔

مغربی ممالک میں شام میں مداخلت یا پھر بشار مخالف قوتوں کو مسلح کرنے کے حوالے سے کافی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں۔ لیکن انہیں یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ یہاں مداخلت اتنی آسان نہیں ہو گی۔ انہیں خدشہ ہے کہ دیے جانے والے ہتھیار کہاں کہاں اور کن کن ہاتھوں استعمال ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ وہ مالی اور لیبیا کی صورتحال میں دیکھ رہے ہیں۔ اور پھر عراق اور افغانستان کے تجربے کے بعد وہ سمجھ چکے ہیں کہ صورتحال میں جانا ایک بات ہے لیکن صورتحال کو سنبھالنا اور پھر اس میں سے واپس نکلنے کی حکمت عملی مرتب کرنا ایک بالکل الگ بات ہے۔

کُرد مسئلے کی پیچیدگی

اس ساری صورتحال میں کردوں کا مسئلہ ایک بار پھر ابھر کر سامنے آ چکا ہے۔ کرد شمالی عراق میں اپنے تئیں خود مختاری حاصل کر چکے ہیں۔ جبکہ شام میں بھی بشار الاسد کردوں کے مسئلے کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور شام کے کردوں کو کچھ رعایتیں دے رہا ہے۔ تاکہ وہ اس کی حکومت کے خلاف سرکشی سے باز رہیں۔ ان حالات میں کردوں کی مہم دوبارہ سے ابھر رہی ہے اور یہ ترکی تک پھیل سکتی ہے کہ جہاں کردوں کی بڑی آبادی موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کردوں کو استعمال کیا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ بہت کھلواڑ ہو رہے ہیں۔ واحد رستہ جو کردوں کو حقیقی طور پر مطمئن کر سکتا ہے وہ ان سبھی ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب کا ہونا ہے جہاں یہ بسے ہوئے ہیں۔ ایک سوشلسٹ فیڈریشن کے اندر ہی ان کی خود مختاری کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ہوتے ہوئے ان کی قسمت پہلے کی طرح ابتر ہی رہے گی۔ انہیں آئے روز خود مختاری یا آزادی کا جھانسا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کسی نہ کسی سامراجی مفاد کو مدنظر رکھتے

ہوئے ہی کیا جاتا ہے۔اور بعد میں ان کو مسلسل دھوکہ دیا جاتا رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ بشارالاسد نسلی مسئلے کو اپنی حکمرانی بچانے کیلئے استعمال کر رہا ہے۔جبکہ خلیجی ملکوں کی دیگر رجعتی حکومتیں بھی نسلی اور مذہبی تنازعات کو اپنے اپنے مذموم مفادات کیلئے ہوا دینے کی کوشش کر رہی ہیں جن کی وجہ سے اس بات کا حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شام کے حصے بخرے ہو جائیں۔جس کے تباہ کن اثرات خطے میں پھیل جائیں گے اور ہمسایہ ملکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

شام میں خانہ جنگی

اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں کہ بشار حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی شام میں ایک خانہ جنگی شروع ہو جائے۔آزاد شامی فوج کے کئی حصے جہادی عناصر کے ساتھ لڑ رہے ہیں جنہیں وہ انقلاب کو ہائی جیک کرنے کا باعث سمجھ رہے ہیں۔انقلاب کا واضح نقطہ نظر رکھنے والی ایک پارٹی کی غیر موجودگی نے اس ساری صورتحال کو بہت بھیانک بنا دیا ہے۔اگر محنت کش طبقہ ایک انقلابی پارٹی کے گرد منظم و متحرک ہوتا تو صورتحال بالکل ہی مختلف ہوتی۔خالص عسکری بنیادوں پر اپوزیشن کی طاقتیں بشار حکومت کو گرانے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ان کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی ایسا کر لیں گے۔اپوزیشن کی صفوں میں رجعتی اسلامی بنیاد پرستوں کے آجانے سے اور ان کی جانب سے طبقاتی جدوجہد کی بجائے نسلی تنازعات کو ہوا دینے کی کوششوں نے اپوزیشن کو شام کے شہریوں کی بڑی تعداد کی حمایت سے دور کر دیا ہوا ہے۔

بشار حکومت کو گرانے کیلئے سب سے موثر طریقہ ایک عام ہڑتال ہے جو سارے ملک کو مفلوج کر کے رکھ دے گی۔اس کیلئے ایک ایسی پارٹی ضروری ہے کہ جو اپنے گرد و رکروں اور غریبوں کو متحد کر سکے اور ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ یہ پارٹی ایک ایسے پروگرام سے لیس ہو جو سبھی سماجی و معاشی مسائل کا حل سامنے لائے کہ جنہوں نے عام لوگوں کی اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔لیکن چونکہ اپوزیشن کی قوتیں ایسے کسی پروگرام سے کوسوں دور ہیں اس لئے ان کی لڑائی

ناگزیر طور پر نسلی اور مذہبی خطوط پر استوار ہو چکی ہے۔ سب سے بہتر پروگرام جو کہ اپوزیشن کے پاس ہے وہ بورژوا جمہوریت کی کوئی شکل وصورت اور آزادمنڈی پر مشتمل ہے لیکن یہ دونوں ہی محنت کشوں اور غریبوں کا کوئی ایک بھی مسئلہ حل کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی سے ہمیں سمجھ آجاتی ہے کہ کیونکر شام ایک فرقہ وارانہ خانہ جنگی کی طرف دھکیلا جا چکا ہے جو کہ طویل بھی ہو سکتی ہے یہاں تک کہ یہ بشار کے جانے کے بعد بھی جاری رہ سکتی ہے۔

ہم نے شام کے انقلاب کی حمایت کی تھی جب یہ شروع ہوا تھا لیکن یہاں ہم یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اب معاملات بدل چکے ہیں دونوں جانب سے ایک ردانقلاب جاری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں ابھی بھی کچھ انقلابی عناصر موجود ہیں خاص طور پر نوجوانوں میں لیکن ساری کیفیت میں اس وقت رجعتی عناصر حاوی ہو چکے ہیں۔ ہم چیزوں کو سیاہ وسفید یا انقلاب اور ردانقلاب کی حالت میں نہیں دیکھتے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انقلاب اور ردانقلاب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص مقام آنے پر ایک نہ ایک حاوی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی حالت مستقل نہیں رہتی۔ شام کے معاملے میں ردانقلابی عناصر کچھ عرصے سے حاوی ہو چکے ہیں۔ ایسی معروضی صورتحال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی بلکہ وقت کے ساتھ تیزی سے بدلتی بھی ہے۔ صورتحال بدل چکی ہے چنانچہ ہمارا تجزیہ بھی بدل چکا ہے۔ ہمیں جو ہے جیسا ہے وہی سمجھنا سمجھانا چاہئے۔ ہم انقلاب یا ردانقلاب کے ساتھ کسی قسم کی رومانوی وابستگی نہیں رکھتے۔ بدقسمتی سے لیفٹسٹوں میں سے کئی ایک جو خود کو مارکس وادی بھی قرار دیتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں فریقین میں سے کسی نہ کسی کی لازمی حمایت کرنی چاہئے۔ اس سے ہمیں سابقہ یوگوسلاویہ یاد آرہا ہے جب کچھ لیفٹسٹ سربوں کے ساتھ تو کئی کروشیائیوں کے حمایتی بن چکے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ جب یوگوسلاویہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا اس وقت کوئی ایک عنصر بھی ترقی پسند نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت باہم برسرپیکار کوئی حصہ ترقی پسند تھا۔ ہر طرف رجعتیت حاوی تھی اور ان میں سامراجیت خاص طور پر جرمن سامراج شامل تھا جس نے مختلف دھڑوں کو آپس میں لڑانے کی سازشیں کی تھیں جن کے باعث یوگوسلاویہ کی فیڈریشن سامراجی مفادات کی آماجگاہ بن گئی۔

شام کے معاملے میں مصراور تیونس میں بنیاد پرستوں کی وقتی کامیابی نے مزید کنفیوژن پیدا کردی۔ان دونوں ملکوں کے اندر انقلابات کے شروع میں ہم دیکھتے ہیں کہ محنت کش طبقہ طاقت پکڑتا جارہا تھا جس کی بدولت وہ ان ملکوں میں قائم مکروہ آمریتوں کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب بھی ہوا۔لیکن پھر جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے کہ اس کے بعد جو خلا پیدا ہوا،اس نے اسلامی بنیاد پرستوں کو صورتحال میں درآنے کا موقع فراہم کیا اور وہ الیکشن جیت گئے ۔جس کی وجہ سے شام میں بھی اسلام پرستوں کو مضبوط ہونے کا جواز اور موقع میسر آ گیا۔حقیقت یہ ہے کہ شام کے مسئلے کے حل کی جڑ مصر اور تیونس میں موجود ہے۔اور شاید اس سے کہیں زیادہ ایران کے اندر۔ شام کی محدود سرحدوں میں شام کے مسئلے کا حل ممکن نہیں،یہاں تک کہ اگر یہاں ایک بڑی سوشلسٹ انقلابی پارٹی بھی موجود ہو تو بھی شام کی حدود میں رہتے ہوئے مسئلے کا حتمی حل نہیں ہو سکے گا۔یہاں تک کہ اگر یہاں ایک کامیاب سوشلسٹ انقلاب ہو بھی جائے تو بھی اسے اپنے آپ کو سنبھالنے کیلئے اپنی سرحدوں سے باہر نکلنا اور پھیلنا ہوگا۔اسے ترکی ایران اور دوسرے ملکوں کی طرف رخ کرنا ہوگا۔اور سب سے اہم اسے مصر میں ایک سوشلسٹ فتح درکار ہوگی جو کہ سب سے بڑا عرب ملک ہے اور جس میں سب سے زیادہ محنت کش بھی موجود ہیں۔اسی سے ہی مشرق وسطیٰ کے محنت کشوں اور نوجوانوں کو رہنمائی میسر آ سکے گی۔

ہمیں یہ سب کچھ شام میں موجود بہترین نوجوان عناصر کو بتانا اور سمجھانا ہوگا۔ہمیں ایک واضح مارکسی تجزیہ بنانا اور وسیع النظری سے صورتحال کی حقیقت کی وضاحت کرنی ہوگی۔ بشار حکومت آخر کار ختم ہو جائے گی لیکن یہ کیسے جاتی ہے اور کون اسے ختم کرتا ہے یہ دیکھنا اہم ہوگا۔لیبیا میں ہم نے دیکھا کہ حکومت گرانے کیلئے سامراج کی امداد حاصل کی گئی جس کے نتیجے میں انتشار اور کنفیوژن پیدا ہوا اور اب بھی سامراجی باہر سے بیٹھ کر سازشیں کر رہے ہیں۔لیبیا کے عام لوگوں کے مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گئے ہیں۔شام میں بھی ایسا ہی ہوگا اگر وہاں بشار کی حکومت کا خاتمہ وہ ملیشیائیں کرتی ہیں جنہیں رجعتی خلیجی ملکوں اور مغربی سامراجیوں کی امداد اور پشت پناہی حاصل ہے۔بالآخر صورتحال کے مطابق

ورکروں کو اپنے پاؤں کی جانب ہی دیکھنا ہوگا۔ وہ منظم ہونا شروع کریں گے۔ محنت کش ٹریڈ یونین تنظیمیں بنائیں گے تاکہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کو ممکن بنا سکیں۔ واقعات کی روشنی میں محنت کش طبقے کی تحریک ایک قوت کے طور پر ابھر کر عوام کی قیادت کیلئے سامنے آئے گی۔ اور جب لوگوں پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ بشار کی حکومت کے جانے سے کچھ بھی نہیں بدلا جا سکا۔ چنانچہ زیادہ سرگرم اور باشعور ورکروں اور نوجوانوں کو مستقبل میں ایک شامی مارکسی اپوزیشن تعمیر کرنے کی تیاری کرنی چاہئے۔ یہ اپوزیشن آگے چل کر بہت اہم کردار ادا کرے گی۔

عرب انقلاب ایک طویل اور اعصاب شکن عمل سے گزرے گا جس دوران عوام بھاری تعداد میں تحریک میں شامل ہوں گے اور لیفٹ کی جانب رجوع کریں گے۔ اسی دوران ہی وقتی اور عارضی وقفے بھی آئیں گے کہ جب ردانقلاب مضبوط ہوتا محسوس ہوگا۔ لیکن انقلاب کسی نہ کسی طرف سے آگے کی جانب پیش قدمی کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ داری میں بیروزگاری، کم اجرتوں اور دیگر مسائل کا حل موجود نہیں۔

مصر اور تیونس میں اس وقت انقلاب بلندی پر ہے اور یہ ناگزیر طور پر دوسرے ملکوں میں بھی پھیلے گا۔ عراق اس سے متاثر ہوگا جبکہ سعودی عرب سمیت دوسری خلیجی ریاستیں بھی اس سے متاثر ہوں گی۔ خطے کے سبھی ملک ایک وقت پر اس سے متاثر ہوں گے۔ مغربی سامراجیوں کی جانب سے ایران کے ذریعے اور خلیجی ریاستوں کے ذریعے تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کہ جس سے سماج کو نسلی و مذہبی فرقہ واریت اور منافرت کا شکار رکھ کے طبقاتی مسئلے کو کاٹنے کی کوشش کی جائے جاری و ساری ہے۔ یہ ایک وقت تک کیلئے تو کارگر رہے گی لیکن سماج کی تہوں میں موجود طبقاتی سوال نے ابھر کر سامنے آنا ہی ہے۔

کویت اور بحرین

ذرا ایک نظر کویت پر ہی ڈالیے جہاں ہم نے تاریخ کے سب سے بڑے مظاہرے ہوتے دیکھے ہیں گزشتہ اکتوبر میں 150000 لوگوں نے اپنی ''خودداری'' کیلئے مارچ کیا۔ کویت جیسے

ملک میں کہ جس کی ساری آبادی 15 لاکھ ہے جبکہ 30 لاکھ غیر ملکی ہیں یہ ایک بہت بڑی پیش رفت ہے۔ تحریک شروع میں بہت ہی اصلاح پسندانہ اور جمہوری انداز میں سامنے آئی لیکن اسے ریاست کی طرف سے سخت بربریت کا سامنا کرنا پڑا۔ سرگرم کارکنوں کے ساتھ سختی کی گئی جس کی وجہ سے ان پر ریاست کا حقیقی چہرہ کھل کر سامنے آ گیا۔ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کیسے ایک جمہوری مطالبات کی حامل تحریک ناگزیر طور پر طبقاتی تنازعے میں بدلتی ہے اور ایک سوشلسٹ انقلاب کی متقاضی ہو جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح تحریک کی قیادت کو خریدنے کی کوشش کی گئی لیکن اس سے تحریک کو دفن نہیں کیا جا سکتا۔ جتنا تشدد کیا جائے گا تحریک میں بھی اتنا ہی زیادہ جوش اور ولولہ ابھرے گا۔ کوئی بھی ریاست اپنے آپ کو قائم دائم رکھنے کیلئے محض اپنی عسکری قوت پر تکیہ نہیں کرتی۔ اسے بہرحال لوگوں کو کم سے کم معیار کی ہی سہی، زندہ رہنے کی سہولتیں فراہم کرنی پڑتی ہیں۔ مبارک حکومت اس کی ایک واضح مثال تھی۔

ادھر بحرین میں بھی ایک شاندار انقلابی تحریک موجود ہے۔ نومبر میں ہم نے یہاں ایک لاکھ سے زائد لوگوں کا مظاہرہ دیکھا ہے۔ عمان میں بھی ایک تحریک موجود ہے۔ جس کے خلاف ریاست نے آہنی ہاتھوں سے بھی نمٹنے کی کوشش کی جبکہ اہم رعایتیں بھی دیں۔

ایران

ایران مصر کے بعد خطے کا دوسرا بڑا اور اہم ملک ہے۔ اپنے حجم کے اعتبار سے بھی اور اپنے محنت کش طبقے کی طاقت کی وجہ سے بھی۔ ہم پہلے بھی ایران میں انقلاب کا، اس کے نشیب و فراز کے ساتھ تجزیہ کر چکے ہیں۔ اس وقت وہاں تحریک بالکل چپ سادھے ہوئے ہے اگرچہ ہم وہاں انقلاب کی ایک دوسری لہر کے اشارے بھی دیکھ رہے ہیں۔ پچھلے عرصے میں ملک کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو چکی ہے جس کے باعث یہاں نئے دھماکے سماج کی کوکھ میں پرورش پا رہے ہیں۔ افراط زر 26 فیصد کو پہنچی ہوئی ہے اور وہ بھی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق۔ صنعتی پیداوار منہدم ہوتی جا رہی ہے۔ مڈل کلاس دیوالیہ ہوتی جا رہی ہے۔ لاکھوں ورکروں کو اجرتیں نہیں مل پا رہیں۔

یوں طبقاتی جدوجہد ایک بار پھر ایجنڈے پر آرہی ہے۔حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر براجمان لوگ سخت پریشان ہیں۔ یہاں تک کہ پولیس چیف کو پچھلے سال میڈیا سے اپیل کرنی پڑ گئی کہ وہ ٹیلی ویژن پر مرغی دکھانے سے گریز کریں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مرغی عیاشی ہو چکی ہے اور اتنی مہنگی ہوگئی ہے کہ اگر یہ عام آدمی کو ٹیلی ویژن سکرین پر بھی نظر آ گئی تو اندیشہ ہے کہ لوگ چاقو چھریاں لے کر امیروں کی طرف دوڑ پڑیں گے اور اس کا خرچہ ان سے وصول کریں گے۔اس کے بقول ''ٹیلی ویژن پر یہ اتنی جذبات انگیز ثابت ہوسکتی ہے کہ یہ ایک نئے انقلابی ابھار کا باعث بھی بن سکتی ہے۔''

انقلابی گارڈز کی حالت یہ ہے کہ ان کو کئی کئی ہفتوں تک تنخواہیں بھی نہیں مل رہیں جو کہ یقینی طور پر حکومت کیلئے اچھی بات نہیں۔ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ مرغی کی چڑھی ہوئی قیمت کی وجہ سے خود رو مظاہرے پھوٹے ہیں۔اس کے علاوہ دیگر غذائی اشیا کے معاملے میں بھی مظاہرے ہوئے ہیں۔فیکٹریوں کے محنت کش بھی بڑھی ہوئی قیمتوں اور کم ہوتی ہوئی اجرتوں پر کئی مظاہرے منظم کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے اندر گھس کر بھی اپنا احتجاج رقم کرا رہے ہیں۔ حکومت کی بالائی سطح پر موجود لوگوں میں بھی شدید تنازعات موجود ہیں۔خامنہ ائی احمدی نژاد پر الزام عائد کرتا ہے اور مطالبہ کر رہا ہے کہ کرنسی چھاپنا بند کی جائے تا کہ مہنگائی کو روکا جا سکے۔جبکہ احمدی کا کہنا ہے کہ خامنائی مغرب والوں کو چھیڑتا رہتا ہے اور مسائل پیدا کر رہا ہے۔اور وہ مسائل سے نمٹنے کیلئے مزید کرنسی چھاپنے پر زور دیے ہوئے ہے۔حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چھ سالوں کے دوران کرنسی کی سپلائی میں سات فیصد اضافہ ہوا ہے۔اسے ''مقداری آسانی'' قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس عمل کو اپنی مقبولیت کیلئے استعمال کرتا آرہا ہے۔اسی دوران ہی احمدی جہاں سبسڈیوں میں کٹوتیاں کرتا جا رہا ہے۔وہاں وہ ہر ایک ایرانی کو چالیس ڈالر ماہانہ دیتا آرہا ہے۔تہران جیسے شہروں میں تو یہ رقم کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن چھوٹے قصبات اور دیہاتوں میں یہ ایک بڑی رقم ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جسے وہ اپنے لئے اگلے الیکشن میں حمایت حاصل کرنے کیلئے استعمال کر رہا ہے۔

حکومتی دھڑوں کے مابین اس تفریق میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بدعنوانی کے

سکینڈلز اوران میں ملوث بالا پرتوں سے تعلق رکھنے والوں کی گرفتاریوں کی مسلسل خبریں سامنے آرہی ہیں۔ یوں ایران میں انقلابی حالات تیار ہورہے ہیں۔لیکن اگر ایران پر اسرائیل یا امریکی سامراج کی جانب سے جنگ مسلط ہوتی ہے تو یہ عمل یکسر رک بھی سکتا ہے۔لیکن اگر ایسا ہوا تو اس سے سارا خطہ مزید انتشار کی زد میں آجائے گا۔ایران کے ساتھ ایک کھلی جنگ کا مطلب آبنائے ہرمز کی بندش ہوگی (کہ جہاں سے دنیا کا 20 فیصد تیل گزرتا ہے)۔یہ ہوا تو اس کے دنیا بھر میں معاشی اثرات مرتب ہوں گے۔اوراسی سے ہی یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کیوں ایران پر بمباری کی بلند بانگ بڑھکوں کے باوجود مغربی سامراجی اس حملے کے اثرات کے خوف سے حملہ کرنے سے ڈرے ہوئے ہیں۔یہی کیفیت اسرائیل کی بھی ہے جو کئی بار ایران کو دھمکیاں دے چکا ہے لیکن ابھی تک ہمت نہیں کر پارہا۔لیکن صورتحال اتنی غیر یقینی اور تضادات سے بھرپور ہے اور جسے سماجی سیاسی اور معاشی بحران مزید گھمبیر کرتا جارہا ہے کہ ایران پر حملے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسرائیل اور فلسطین

آج بھی فلسطینی پچاس سال پہلے کی نسبت حق خودمختاری سے کہیں زیادہ دور ہیں۔ دو ریاستوں کا تصور ایک واضح ناکامی کی صورت میں سامنے آچکا ہے۔نام نہاد مسلح جدوجہد جو کہ دراصل انفرادی دہشت گردی ہی کی ایک شکل ہے،بھی ایک ناکارہ ہتھیار ثابت ہوچکی ہے جس سے عام فلسطینیوں کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکا۔موجودہ سرمایہ دارانہ کیفیات میں کوئی حل ممکن نہیں اور نہ ہی سرحدوں کی تنگ نظری سے کوئی بہتری آسکے گی۔شاید یہ وہ بات ہے جسے لوگ سننا پسند نہ کریں لیکن سچ یہی ہے۔

تاہم یہ علاقہ بھی عرب بہار سے متاثر ہوا ہے۔ہم نے غزہ،مغربی کنارے یہاں تک کہ خود اسرائیل کے اندر بڑی تحریکیں اور مظاہرے دیکھے ہیں. اگست 2011ء میں اسرائیل میں ایک بڑی عوامی تحریک ابھری جس میں لاکھوں لوگ سماجی مسائل اور مطالبات کیلئے سڑکوں پر نکل آئے۔

یہ ایک انتہائی شاندار تحریک تھی۔جس کے نعروں اور بینروں کے الفاظ میں درج تھا کہ ''مصریوں کی طرح حرکت میں آؤ'' جبکہ چے گویرا کی شرٹیں اور تصاویر بھی تحریک کے مزاج کی عکاسی کرتی رہیں۔لوگ حسنی مبارک، بن علی اور نیتن یاہو کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ تحریک ایک طبقاتی کردار کی حامل تھی اور یہ بھی کہ اسرائیلی سماج کے اندرونی تضادات کتنے شدید اور گہرے ہو چکے ہیں۔اس تحریک کے اثرات ہمیں اسرائیل میں ہونے والے حالیہ الیکشن میں بھی نظر آئے ہیں جن میں لیفٹ کی کچھ پارٹیوں کو پہلے سے زیادہ ووٹ ملے ہیں۔یہ دراصل نیتن یاہو کی ایک کمزوری تھی اور سماج میں بائیں اور دائیں کی پولرائزیشن کا بھی اظہار تھا۔یہ اسرائیلی سماج میں پیدا ہونے والی طبقاتی تقسیم کی بھی عکاسی کرتی ہے اور طبقاتی جدوجہد کی بھی، جو مستقبل میں کسی مرحلے پر اپنا اظہار کرے گی۔فلسطینی آبادی کے درمیان بھی ہم ایسی ہی ایک تحریک کو محسوس کر سکتے ہیں جو کہ عرب خطے میں موجود ہے۔اس دوران جبکہ الفتح انتظام وانصرام میں سامراج اور خاص طور پر اسرائیل کے ساتھ شراکت داری کیے ہوئے تھی اور معاملات کی نگرانی کر رہی تھی، اس سیاسی خلا کا فائدہ حماس نے اٹھایا۔جب یہ ایک قوت کے طور پر ابھری اور اس نے غزہ کا کنٹرول کر لیا تو فلسطینی آبادی میں اسلام کے اثرات پر بحث شروع ہوئی۔ کچھ لیفٹسٹوں نے اسے بھی ایک آگے کی طرف قدم قرار دے ڈالا۔ہمیں کسی طور نہیں بھولنا چاہئے کہ اسرائیل کی موساد تھی کہ جس نے حماس اور اسلامی جہاد وغیرہ کی بنیاد رکھی اور اس کیلئے فنڈز فراہم کیے اور اسے پروان چڑھایا۔اور یہ سب کچھ فلسطین میں لیفٹ عناصر کو ابھرنے سے روکنے کیلئے کیا گیا۔یہ تب ہوا کہ جب اسرائیل کے مرکزی دشمن پی ایل او اور فتح ہوا کرتی تھی اور ایسا ہر جگہ کیا گیا۔افغانستان کیلئے بھی اسلامی بنیاد پرستوں کو پروان چڑھایا گیا تاکہ روس کے اثرات کا مقابلہ کیا جائے۔

یہ تصور بھی کہ بنیاد پرست سامراج مخالف ہیں، انتہائی لغو ہے۔یہ اسلامی بنیاد پرست مکمل طور پر رجعتی ہیں اور کسی طرح بھی کوئی ترقی پسندانہ کردار ادا نہیں کر سکتے۔اس کا ثبوت اب غزہ سے بھی سامنے آ رہا ہے۔جہاں اب حماس اسرائیل کیلئے نگرانی کا فریضہ سرانجام دے رہی

ہے، جیسا کہ ماضی میں فتح کرتی رہی۔ شام کے معاملے کی طرح سے ہم اسرائیل اور فلسطین کے مسئلے میں کوئی جذباتی مؤقف نہیں اپنا سکتے۔ پچاس سال پہلے ہمارا مؤقف تھا کہ فلسطین کے سوال کا حل طبقاتی جدوجہد میں مضمر ہے اور ایسا مشرق وسطیٰ کی سوشلسٹ فیڈریشن کے قیام سے ہی ممکن ہے۔ ہمارے اس مؤقف کا آج تک اصلاح پسندوں اور سٹالنسٹ پروپیگنڈہ کرنے والوں نے ہمیشہ مذاق اڑایا لیکن ہم آج بھی اپنی پوزیشن پر قائم ودائم ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کے یہودیوں کو عرب ریاستوں سے قتل کر دیے جانے یا تباہ و برباد کر دیے جانے کا خوف لاحق ہے۔ اور یہی وہ خوف ہے جس کی وجہ سے وہ نیتن یاہو جیسے لیڈروں کی پناہ گاہ کا آسرا لیتے آرہے ہیں۔ حالیہ عرصے میں حماس اور اس سے پہلے جس طرح پی ایل او نے یہودیوں کو نکال باہر کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی تب سے اب تک اکثریتی یہودی آبادی اسرائیل کے حکمران طبقات کے رحم وکرم پر رہنے پر مجبور چلی آرہی ہے۔ چنانچہ یہ نقطہ نظر صیہونیت کو کمزور نہیں بلکہ اسے مضبوط کرنے کا وسیلہ بنا رہا ہے۔

مارکس وادی صیہونی ریاست کے مخالف رہے ہیں۔ یہ دوسری بورژوا ریاستوں کی طرح ایک سرمایہ دار اور سامراجی ریاست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کی ریاست کا خاتمہ کس طرح سے ممکن ہوسکتا ہے۔ اس کیلئے لازمی ہے کہ پہلے اسرائیلی سماج خود کو طبقاتی بنیادوں پر توڑے۔ دوسرے معنوں میں اسرائیل کے محنت کش طبقے کا اعتماد جیتا جائے۔ اس ساری کیفیت میں ایک اہم کنجی اسرائیل کا محنت کش طبقہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کیوں ایک سوشلسٹ یہودی و فلسطینی وفاقی ریاست کی بات کرتے ہیں۔ جس میں سب اپنی اپنی خودمختاری سے رہ سکیں گے جس میں سب کے اپنے اپنے تعلیمی دارے ہوں گے، اپنی اپنی زبانیں بولی جائیں گی، اور سب کو اپنی مرضی کی مذہبی وابستگی کا حق حاصل ہوگا۔ ایسی ہی ریاست میں مختلف علاقوں کے لوگ ہنسی خوشی یہاں سے وہاں سفر کرسکیں گے۔ اور یہ سب کچھ مشرق وسطیٰ کی سوشلسٹ فیڈریشن کا حصہ ہوگا۔ جس میں سارے حقوق میسر ہوں گے، آزادی کا بھی خودمختاری کا بھی۔ جس میں سبھی ایک سوشلسٹ منصوبہ بند معیشت کے تحت زندگی بسر کریں گے اور جس میں خطے میں موجود سبھی وسائل کو بروئے کار لاتے

ہوئے کم ہی مدت کے عرصے میں سب کیلئے روزگار موجود ہوگا، جس کی اجرتیں بھی عمدہ ہوں گی، خوراک بھی بہتر ہوگی، علاج بھی دستیاب ہوگا، تعلیم بھی ہوگی اور یہ سب کیلئے ہوگا۔ خواہ اس کا کوئی مذہب گا، کوئی زبان یا کوئی نسل ہو۔ انقلاب اپنے عمل کے دوران بھی قومی مسئلے کو واضح کر دے گا۔ وقت کے ساتھ ہی بنیادی معاشی اور سماجی مسائل کے حل ہوجانے کے بعد اولڈ ایج کی مراعات اور سہولیات کو بھی سبسڈائز کر دیا جائے گا۔

سرمایہ دارانہ بنیادوں پر کوئی حل ممکن نہیں ہے۔ اگر سرمایہ داری کے تحت فلسطین کی ریاست قائم بھی ہوجائے تو اس کی معیشت سیاست اور عسکریت کسی طور قابل بھروسہ نہیں ہوں گی اور یہ اسرائیل کے ہی مرہون منت رہے گی۔ ایسی ریاست سے عام فلسطینی کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔

مارکس وادی درپیش سوالوں کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں اور خود کو اکیلے ملکوں کی تنگ سرحدوں کی تنگی کا شکار نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہم کئی عشروں سے واضح کرتے آرہے ہیں کہ مصر اور ایران جیسے خطے کے دو اہم ملکوں کے انقلابات فلسطینیوں اور یہودیوں دونوں کے مسائل کو حل کرسکیں گے۔ ان مسائل کا جواب ایک طبقاتی جدوجہد دے گی۔

ایسی کیفیت کے اندر ہم عرب کے ملاؤں، شیوخ، سلطانوں، بادشاہوں، عرب لیگ اور فلسطینی قیادت (حماس اور فتح، دونوں) کے منافقانہ اور مجرمانہ کردار کو دیکھ سکتے ہیں جو سب کے سب سرمایہ داری کی حفاظت اور گماشتگی کرتے چلے آرہے ہیں۔ سب کے سب قومی تنازعات کو ہوا دیتے آرہے ہیں اور یہ سب اس لئے کہ ان کے اپنے مفادات اس سارے کھلواڑ سے وابستہ ہیں۔ عرب اور اسرائیلی محنت کش طبقوں کا اتحاد جن میں اسرائیلی عرب بھی شامل ہیں، واحد راستہ ہے جسے اپنا آکر اپنے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اسے شکست دی جاسکتی ہے۔ اسرائیل کا حکمران طبقہ بھی غزہ میں طبقاتی کشمکش کو کاٹنے کیلئے سرگرم چلا آرہا ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ حماس اور اسرائیل آپس میں گتھم گتھا ہیں جبکہ دراصل وہ ایک دوسرے کو تحفظ دے رہے ہوتے ہیں۔ جب حماس اسرائیل پر راکٹ داغتی ہے جیسا کہ وہ حال میں کر چکی ہے تو اس سے اسرائیلی حکومت کو آسانی ہوجاتی ہے اور موقع مل جاتا ہے کہ وہ اسرائیل میں ابھر رہے طبقاتی سوال کو کند کر

سکے۔وہ ایک ایسا ماحول بنالیتی ہے کہ وہ ایک محصور ملک ہے جسے دشمنوں سے بچانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔اور پھر اسرائیل غزہ پر بھاری بمباری کرتا ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے تمام تر شعلہ بیانیوں کے باوجود حماس اور فتح کی قیادت اسرائیل کے حکمران طبقے جیسا ہی کردار ادا کر رہی ہے۔یہ سب علاقے میں طبقاتی جدوجہد سے خوفزدہ ہیں۔

حرفِ آخر

ہم مشرق وسطیٰ کی قیادت کے پاس دولت کے نہ ختم ہونے والے انبار دیکھ سکتے ہیں۔امیر ترین لوگ کس طرح وسیع تر ہوتی غربت اور ضرورت کے عین بیچ کس عیاشانہ انداز میں جی رہے ہیں۔اس خطے کا حکمران طبقہ دنیا کا سب سے زیادہ رعونت انگیز اور اہانت آمیز حکمران طبقہ ہے۔ان کے بس میں جو کچھ ہوگا یہ اپنے مفادات کے دفاع کیلئے کر گزرنے سے کبھی دریغ نہیں کریں گے۔یہ ہم شام سمیت کئی جگہوں پر دیکھ رہے ہیں کہ کیسے یہ اپنی بے حد وحساب دولت کو رجعتی اور وحشی قوتوں کے فروغ کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔اور جنہیں یہ حقیقی انقلاب سے روکنے کیلئے خونریز نسلی و مذہبی فسادات کیلئے کام میں لا رہے ہیں۔یہ حکمران خود کو کوئی اعلیٰ آسمانی مخلوق تصور کرتے ہیں کہ جنہیں حکمرانی کا خدائی فریضہ سونپ دیا گیا ہے۔ان کے علاوہ باقی سب غریبوں، مزدوروں، بیروزگار نوجوانوں اور عام انسانوں کو ایسی ہی ذلت آمیز زندگی گزارنی ہوگی جیسی وہ گزارتے چلے آرہے ہیں۔لیکن یہ حکمران ایک ایسے بارود کے ڈبے پر بیٹھے ہوئے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔یہ کیفیت اس تفریق اور امتیاز کی بدولت ہے جو کہ ان امیر ترین اور غریب ترین لوگوں کے مابین پیدا ہو چکی ہے۔

ہم سرمایہ داری اور سامراجیت کے ساتھ ایک ناقابل مصالحت جنگ میں ہیں۔ان کے ساتھ ان کے تمام تر علاقائی گماشتہ حکمرانوں کے بھی۔اس کے ساتھ ہی ہم خطے میں موجود طبقات کی قوتوں کو بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی انقلاب اپنی منزل سے بہت دور ہے

اور مصر جیسے ملک میں یہ مزید بلند پیمانے کی جانب بڑھ رہا ہے۔

یہ ایک پیچیدہ صورتحال ہے کہ جس میں انقلاب اور ردانقلاب ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں۔ہمیں ایک ماہرانہ مارکسی طریق کار کی ضرورت ہے جس کی مدد سے ہم یہ ادراک کر سکیں کہ حقیقت میں کیا ہو رہا ہے، ہمیں خود کو کنفیوژن سے بچانا ہے۔ہمیں انقلابی اور ردانقلابی قوتوں کے درمیان تمیز کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔عمومی طور پر تناظر بہت خوش آئند ہے۔ریڈیکلائزیشن میں بڑھوتری ہو رہی ہے اور عوام اپنے ہر تجربے سے سیکھ رہے ہیں۔اس وجہ سے مارکسی نظریات کی ترویج کیلئے فضا بہت بہتر ہو رہی ہے اور ہم خطے میں مارکسزم کی قوتیں تعمیر کر سکتے ہیں۔انقلاب کیلئے کوئی راستہ بھی آسان نہیں ہوا کرتا۔بلکہ انقلاب ہی واحد آسان راستہ ہوتا ہے۔

عرب انقلاب انسانی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہے۔لاکھوں کروڑوں انسان جو کہ حقیقت میں غلامانہ زندگی بسر کرتے آ رہے تھے، اب عمل کے میدان میں اتر رہے ہیں۔لیکن جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ انقلاب کبھی اور کہیں کوئی سنگل ایکٹ ڈرامہ نہیں ہوتا۔یہ لازمی طور پر کئی مرحلوں سے گزرتا ہے اور گزرے گا بھی۔مصر کا محنت کش طبقہ عرب انقلاب کا مرکز و محور ہے۔پہلے مراحل میں عوام سڑکوں پر نکلتے ہیں جہاں وہ اپنی طاقت کے احساس سے مالا مال ہوتے ہیں اور انہیں پتہ چلتا ہے کہ انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔اور یہ کہ تحریک نے ان میں جو جذبہ پیدا کیا ہے وہی انہیں آگے لے کر جائے گا۔ایسے میں ایک ''قومی وحدت'' کا احساس جاگزیں ہوتا ہے جو کہ جوش و جذبے سے بھرپور ہوتا ہے اور ایک جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔اور پھر جب آمریت کے جانے کے بعد چھا جانے والی دھول چھٹتی ہے تو عوام کو احساس ہوتا ہے کہ معاملات اتنے بھی آسان نہیں جتنا وہ شروع میں سمجھ رہے تھے۔وہ یہ بھی جان جاتے ہیں کہ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔سب سے باشعور پرتیں سب سے پہلے اس نتیجے سے سبق سیکھتی ہیں۔لیکن مختلف پرتیں اس کے مختلف نتائج اخذ کرتی ہیں۔مصر میں ہونے والے الیکشن کے نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ سماج کی سب سے پسماندہ پرتوں، دیہی و کسان وغیرہ کے اخذ کردہ نتائج نے شہروں کے محنت کشوں اور شہریوں

کے نتائج پر فتح حاصل کی ۔لیکن اب یہ پسماندہ پرتیں بھی سیکھ رہی ہیں کہ اخوان المسلمون بھی ایک فراڈ ہی ہیں ۔کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے حالات میں کوئی بہتری نہیں آئی ۔وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے بھی ویسے ہی طبقاتی مفادات ہیں جیسا کہ مبارک حکومت کے تھے ۔چنانچہ اب انقلاب دراصل ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے ۔جس میں طبقاتی پولرائزیشن میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے ۔اخوان المسلمون اور سلفیوں کے خلاف ردعمل شروع ہو رہا ہے ۔اسلامی پارٹیاں اپنے کرتوتوں سے عوام میں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں۔عوام اپنے تجربے سے سیکھ رہے ہیں۔

کون شک کر سکتا ہے کہ اگر بالشویک جیسی ایک پارٹی اس کیفیت میں موجود ہوتی تو مصری محنت کش اقتدار پر براجمان نہ ہو جاتے ؟المیہ یہ ہے کہ ایسی کوئی پارٹی موجود نہیں ۔لہٰذا یہ عمل اپنے نتائج کیلئے سالوں کا عرصہ لے گا۔ماضی میں، عالمی جنگ کے بعد کے دور میں نوآبادیاتی انقلابات نے مختلف اقسام کی ہیبت ناک گمراہی پیدا کیے رکھی اور یہ سب اس لئے ہوا کہ یورپ اور شمالی امریکہ کا انقلاب بہت ہی پیچھے رہ گیا تھا۔لیکن اب معاملات بالکل مختلف ہو چکے ہیں جیسا کہ ہم اپنے سامنے ایک عالمگیر انقلاب کو برپا ہوتا دیکھ رہے ہیں ۔ہم ٹراٹسکی کے نظریہ مسلسل انقلاب پر آج بھی پختہ یقین کے ساتھ موجود ہیں۔سامراج کی موجودہ کیفیات میں پسماندہ ملکوں کیلئے ناممکن ہے کہ وہ بورژوا جمہوری انقلاب کے مسائل حل کر سکیں گے۔یہ مؤقف گزشتہ 70 سالوں کے دوران سچ ثابت ہو چکا ہے۔معمول کی ''آزادی'' سے کوئی بھی حل برآمد نہیں کیا جا سکا۔یہ سبھی آزاد ممالک سامراج کی معاشی زنجیروں سے جکڑے رہے ہیں اور اب بھی جکڑے ہوئے ہیں ۔تاہم اب عرب انقلاب سرمایہ دارانہ نظام کے ایک عالمگیر بحران کی موجودگی میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اور یہ انقلاب یورپ کے عین قلب تک رسائی حاصل کر چکا ہے جس کے نتیجے میں کئی ملکوں میں بڑی عوامی تحریکیں سامنے آ رہی ہیں ۔اور یوں اب انقلاب جدید ترقی یافتہ ممالک کے ایجنڈے پر آ چکا ہے ۔ہم دیکھ چکے ہیں کیسے عرب انقلاب نے جدید سرمایہ دار

ملکوں کو متاثر کیا اور اس کے بعد پھر ان جدید ملکوں کی تحریکیں واپس اپنے اثرات سابقہ نوآبادیاتی ملکوں کی طرف منتقل کر رہی ہیں۔

جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ عالمی انقلاب کے تانے بانے ایک دوسرے سے پیوست اور مربوط ہو رہے ہیں، اوپر سے بحران تمام ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جا رہا ہے اور سب کو ایک ہی طرف دھکیل رہا ہے، یعنی سوشلسٹ انقلاب کی طرف۔

ضمیمہ

وینزویلا

سست روی سے آگے بڑھتا انقلاب!

ہوگو شاویز کی غیر حاضری کی وجہ سے دس جنوری کو ہونے والی نئی مدتِ صدارت کے لیے حلف برداری کے التوا کے بعد، میڈیا میں نہ صرف شاویز کی سرطان سے صحت یابی بلکہ وینزویلا میں ایک دہائی سے زیادہ مدت سے جاری انقلابی عمل کے مستقبل سے متعلق ہر طرح کی قیاس آرائیاں جاری ہیں۔ اگرچہ شاویز چوتھے آپریشن کے بعد کچھ عرصہ کیوبا میں گزارنے کے بعد واپس وینزویلا آچکا ہے لیکن اس کی حالت نازک ہے اور اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ زیادہ عرصہ تک نہ جی پائے۔ اس امکان پر وینزویلا کی اشرافیہ اور عالمی سرمایہ داری کے منصوبہ ساز خوشی سے پھولے نہیں سما رہے۔ جنوری میں وینزویلا کی عدالتوں نے حلف برداری کو موخر کرنے کی اجازت دے دی اور شاویز کا نامزد کردہ جانشین اور نائب صدر نکولس مادورو اس کی عدم موجودگی کے دوران نازک وقت میں قائم مقام صدر کے فرائض انجام دیتا رہا۔

گزشتہ برس 7 اکتوبر کو ہونے والے انتخابات میں شاویز 55 فیصد ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہوا تھا جبکہ اپوزیشن کے مشترکہ امیدوار ایزیک کاپریلس کو 44 فیصد ووٹ پڑے۔ حالیہ صدارتی انتخابات سے قبل اشرافیہ اور عالمی بورژوا میڈیا اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ 1998ء کے انتخابات میں شاویز کی فتح کے چودہ برس بعد اب وہ اسے شکست دے کر ایک بار پھر سے دائیں بازو کی حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب ہو پائیں گے۔ لیکن شاویز کے خلاف فتح یاب ہونے کی یہ توقعات بالکل غیر حقیقی بھی نہیں تھیں۔ بولیویرین حکومت کے اقتدار میں آنے کے کئی برس بعد بھی، انقلاب مکمل نہیں ہوسکا اور وینزویلا میں ابھی تک سرمایہ داری ہی مروجہ معاشی نظام ہے۔ اس وجہ

سے بے پناہ افراطِ زر اور شکستہ انفراسٹرکچر کی وجہ سے بجلی کی طویل بندش جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جو جرائم اور عدم تحفظ میں اضافے کا موجب بنے ہیں۔ حکمران بیوروکریسی کی کرپشن، نالائقی اور نااہلی کی وجہ سے محنت کشوں اور نوجوانوں کی باشعور پرتوں میں جھنجلاہٹ بڑھ رہی ہے۔

لیکن انتخابات کے برس کچھ ایسے عوامل اور اقدامات سامنے آئے جن سے سیاسی اور مالی طور پر امریکی سامراج کی حمایت یافتہ اشرافیہ اور دائیں بازو کی امیدیں اور سپنے خاک میں مل گئے۔ اس برس حکومت نے انقلاب کے سماجی اثرات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑے پیمانے پر اخراجات کیے جس کا لاکھوں لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ صحت اور تعلیم کی مفت سہولیات کے علاوہ رہائش کے شعبے میں بڑے پیمانے کے اقدامات کا آغاز کیا گیا۔

گزشتہ دو برسوں میں 350,000 نئے گھر تعمیر کر کے مقامی کونسلوں کے ذریعے تقسیم کیے گئے۔ یہ گھر سیلابوں، مٹی کے تودوں اور دیگر قدرتی آفات میں بے گھر ہو جانے والوں کو دیے گئے۔ دو کروڑ ستر لاکھ کی آبادی میں سے اس سکیم سے پندرہ لاکھ لوگ فیض یاب ہوئے جن میں جھونپڑ پٹیوں کی تنگ و تاریک کٹیاؤں میں رہنے والے بھی شامل ہیں۔ اس برس 380,000 مزید گھروں کی تعمیر کا منصوبہ ہے۔ بزرگوں، تنہا والدین اور بے روزگاروں کی بھی قابل ذکر مالی معاونت کی گئی۔

عوام بخوبی جانتے ہیں کہ اپوزیشن کے برسرِ اقتدار آنے پر ان تمام حاصلات اور سہولیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ شاویز کی فتح کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ انتخابی مہم کی کمزور شروعات کے باوجود، شکست کے منڈلاتے ہوئے خطرے نے پی ایس یو وی (یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی آف وینزویلا) کی قیادت کو انتخابی مہم کو از سرِ نو طبقاتی اور نظریاتی بنیادوں پر چلانے اور سرمایہ داری کے خلاف اور انقلابی سوشلزم کا پروگرام دینے پر مجبور کیا۔ اس نے عوام میں تحرک اور انقلابی موڈ کو جنم دیا جو شاویز کی فتح کی کلید بنا۔

سرمایہ دارانہ رشتوں کی موجودگی میں کی جانے بڑی اصلاحات کے نتیجے میں ہونے والی ترقی کا کردار ناہموار ہے، جس کی وجہ سے نئے تضادات جنم لے رہے ہیں۔ ایک جانب عوام کے

معیار زندگی میں قابل ذکر بہتری آئی ہے، جبکہ دوسری طرف پیداواری انفراسٹرکچر میں بہت کم سرمایہ کاری کی گئی ہے اور سرمایہ داروں نے کئی طریقوں سے معیشت کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں پیسے کی بیرونِ ملک منتقلی اور بنیادی غذائی ضروریات کی زخیرہ اندوزی وغیرہ شامل ہیں۔ الیکشن کے برس کیے جانے بڑے پیمانے کے اخراجات سے معیشت کی حالت بہت نازک ہے۔ تیل کی آمدنی عالمی منڈی سے کی جانے والی درآمدات کے اخراجات کو پورا نہیں کر رہی۔ بولیوار کرنسی کی زیادہ قدر سے تجارتی خسارہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بجٹ کا حقیقی خسارہ مجموعی قومی پیداوار (جی ڈی پی) کے بیس فیصد کے قریب جا پہنچا ہے۔

ردانقلاب نے اس عمل کو روکنے اور واپس لے جانے کی بہت کوششیں کی ہیں۔ 2002ء میں ایک فوجی بغاوت کے ذریعے شاویز کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ لیکن 48 گھنٹوں میں عوام نے اس بغاوت کو شکست دے دی اور شاویز صدارتی محل میں لوٹ آیا۔ اس وقت انقلاب بہت پرامن انداز میں مکمل ہو سکتا تھا کیونکہ فوج، پولیس، چرچ اور میڈیا مفلوج ہو چکے تھے۔ انقلابِ وینزویلا قدرت کے قوانین کے برخلاف دس سال سے زیادہ عرصے سے حرکت میں ہے۔ اس وجہ سے یہ ایک غیر معمولی انقلابی عمل ہے جہاں اتنے طویل دورانیے کے بعد بھی حتمی مقاصد حاصل نہیں ہوئے۔ اگرچہ عوام شاویز کی حمایت اور تعریف کرتے ہیں، لیکن وہ سرکاری بیوروکریسی سے سخت متنفر ہیں۔ اس کے باوجود عوام کی عزم و ہمت حیرت انگیز ہے۔ 16 دسمبر کو ہونے والے علاقائی انتخابات میں شاویز (جو اس وقت علاج کے لئے کیوبا جا رہے تھے) کے امیدواروں کو ہمدردی کا ووٹ ملا۔ پی ایس یو وی کے امیدوار گورنروں کی 23 میں سے 20 نشستوں پر کامیاب ہوئے۔ اس طرح سے جب دائیں بازو نے شاویز کی بیماری کو استعمال کرتے ہوئے ملک میں عدم استحکام پھیلانے کی کوشش کی تو عوام نے شاویز کی حمایت میں بہت بڑی ریلی نکال کر اپوزیشن کو منہ توڑ جواب دیا۔

شاویز کے علاج کے لیے کیوبا جانے سے بیوروکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان طاقت کے حصول کی شدید لڑائی شروع ہو گئی۔ اگرچہ اس وقت دایاں بازو اور ردِانقلابی قوتیں

کئی سالوں تک انقلاب کو تھکا کر ختم کرنے کے طویل مدتی تناظر پر عمل پیراں ہیں لیکن یہ لوگ سامنے آ کر بھی انقلاب کے خلاف وار کر سکتے ہیں۔ شاویز کی جانب سے فوج کی کئی مرتبہ تطہیر کے باوجود مال کمانے والے اشرافیہ جرنیلوں کی جانب سے فوجی بغاوت کا امکان موجود ہے۔ لیکن سامراج کی کوششیں بولیویرین تحریک کے بیوروکریٹک دائیں بازو کے ذریعے ردِ انقلاب کو کامیاب بنانے پر مرکوز ہیں۔ بہت عرصے سے میڈیا پر 'شاویز کے بغیر شاویزازم' کی باتیں ہو رہی ہیں۔ شاویز کی موت کی صورت میں شاویز کی حمایت کی وجہ سے اگر کیوبا کی جانب جھکاؤ رکھنے والا ماڈورو صدر منتخب ہو جاتا ہے تو یہ حکومت زیادہ عرصہ نہیں چلے گی اور دس برس سے خوف میں مبتلا ظالم بورژوازی انتہائی بے رحم ردِ انقلاب کر سکتی ہے۔ لیکن عوام اپنے عدم اطمینان کے اظہار کا راستہ تراش رہے ہیں۔ پی ایس یو وی کے اندر طبقاتی بنیادوں پر صف آرائی بڑھ رہی ہے۔ اگر پارٹی کے اندر اس جدوجہد میں مارکسسٹ کامیاب ہو جاتے ہیں اور پی ایس یو وی سرمایہ دارنہ اثاثوں اور وسائل کو ضبط کر لیتی ہے تو انقلاب آگے بڑھتے ہوئے ردِ انقلاب اور سامراج کو فیصلہ کن شکست دے ڈالے گا۔